طلوعِ اسلام

نومبر ۱۹۴۱ء November-1941

بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انسانی حیاتِ اجتماعیہ کا

ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

دہلی

دورِ جدید

مرتب		بدل اشتراک	پانچ روپیہ سالانہ 5/-
اخوندزادہ حسین امام		ششماہی	تین روپے 3/-
جلد (۴)	شمارہ (۱۱)	فی پرچہ	آٹھ آنے

شوال المکرم ۱۳۶۶ھ مطابق نومبر ۱۹۴۷ء

فہرستِ مضامین

لمعات	ادارہ	۱-۱۶
شاہ سید احمد شہیدؒ کی سیرت پر ایک نظر	جناب ضیاء الدین احمد صاحب بی۔ اے۔	۱۷-۲۸
رمزِ غلامی	جناب اسعد ملتانی	۲۹
شاہدِ عادل		۳۰-۳۱
توجہ طلب		۳۲
نوجوانوں سے چند باتیں۔	جناب ڈاکٹر رضی الدین صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ	۳۳-۴۰
حقائق و عبر	ادارہ	۴۱-۵۵
نعرۂ حق	جناب پروفیسر تاج محمد صاحب خیال [illegible] پرنسپل زمیندارہ کالج گجرات	۵۶
نسخہ اور اس کا استعمال	ادارہ	۵۷-۶۵

لمعات

رمضان المقدس کا مہینہ اپنی تمام عظمتوں اور برکتوں کو ساتھ لے کر آیا اور چلا گیا۔ اس گئے گذرے زمانہ میں بھی جس پابندی۔ اہتمام اور حسنِ عقیدت سے مسلمان اس کٹھن منزل کو خندہ پیشانی سے طے کرتے ہیں، دنیا کی کسی دوسری قوم میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ غور فرمایئے۔ سال بھر تک کھانے پینے کا ایک خاص نظام متعین ہوتا ہے۔ لیکن ایک شام جب نیا چاند رمضان کی آمد کی اطلاع دیتا ہے تو یکلخت یہ پورے کا پورا نظام بدل دیا جاتا ہے اور یوں یہ ملتِ حنیفہ ساری دنیا سے متمیز ہو کر الگ نظر آنے لگ جاتی ہے۔ پورا مہینہ دن بھر کی بھوک اور پیاس اور شب بھر کی تسبیح و تہلیل میں گذار دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک اجتماعِ عظیم پر یہ انقلاب آفریں مرحلہ ختم ہو جاتا ہے۔

دنیا کی ہر قوم کے لئے سال بھر میں ایسے دن آتے ہیں جنھیں وہ قوم اپنے قومی تیوہار سمجھ کر مناتی ہے۔ ان تیوہاروں کی تقاریب اور ان کے منانے کے انداز و طریق کو سامنے رکھئے اور اس کے بعد ان کا اس اسلامی "تیوہار" کے ساتھ مقابلہ کیجئے تو بادنیٰ تدبر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ اسلام اور دیگر ادیانِ عالم میں کیا فرق ہے۔ غور فرمایئے کہ یہ "تیوہار" کس تقریب کی یاد میں منایا جاتا ہے؟ کسی انسان کی یادگار نہیں۔ موسموں کے تغیر و تبدل کی خوشی میں نہیں۔ دیوی دیوتاؤں کے افسانوی قصوں کی یاد میں نہیں۔ بلکہ تقریب یہ ہے کہ اس مہینے میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رشد و ہدایت کے لئے وہ ضابطۂ قوانین مرحمت فرمایا جو ان کے لئے دنیا اور آخرت کی سرفرازیوں اور سربلندیوں کا ذریعہ اور نظامِ زندگی کا محور قرار دیا گیا ہے۔ کیا دنیا کی کسی دوسری قوم میں اس کی نظیر مل سکتی ہے کہ اس قسم کی تقریب کی یادگار میں "تیوہار" منایا جائے۔ اس کے بعد تیوہار منانے کے انداز پر غور کیجئے تو وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ روزے کے کیا فوائد ہیں۔ اس کا فلسفہ کیا ہے؟ اس کے متعلق آپ نے بہت کچھ پڑھا اور سنا ہوگا۔ لیکن اس کے لئے ہمیں انسانوں کے بتائے ہوئے فوائد اور تحقیق کردہ

فلسفہ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ جس حکیم مطلق نے یہ فریضہ عائد کیا ہے خود اُسی نے بتا دیا ہے کہ ان کی علت کیا ہے اور ان سے مقصود کیا ؟ قرآن کریم کا اپنے احکام کے بارے میں ایک خاص انداز ہے۔ وہ ایک حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتا ہے کہ اس حکم کی تعمیل سے کیا کیا نتائج مرتب ہونگے وہی نتائج اس حکم کی علت اور مقصود ہوتے ہیں۔ اس سے دو فائدے سامنے آجاتے ہیں۔ ایک تو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس حکم کی غایت کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم نے صحیح معنوں میں اس کی تعمیل بھی کی ہے یا نہیں ؟ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک طبیب آپ کے مرض کی تشخیص کرتا ہے اس کے بعد نسخہ تجویز کرتا ہے اور بتا دیتا ہے کہ اس کے استعمال سے کیا نتائج مرتب ہونگے۔ اب اگر طبیب کی حذاقت پر ایمان ہو نسخہ کی صحت کا یقین ہو۔ دوائی بالکل صحیح ہو۔ استعمال ہدایت کے مطابق ہو۔ تو اس کا لازمی نتیجہ وہی ہونا چاہئے جو طبیب نے بتایا تھا۔ اگر یہ نتائج مرتب نہیں ہوتے تو آپ کو لامحالہ سوچنا ہوگا کہ کہاں نقص رہ گیا ہے ؟ کون سی کمی واقع ہو گئی ہے ؟ قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ نسخہ تجویز کرنے کے بعد واضح الفاظ میں بتا دیتا ہے کہ اس کے استعمال کے بعد کس قسم کے نتائج مرتب ہونگے۔ اگر وہ نتائج ویسے ہی مرتب ہوئے ہیں تو سمجھ لیجئے کہ نسخہ کا استعمال صحیح ہو رہا ہے۔ لیکن اگر نتائج میں فرق ہے تو ہمیں یقیناً یہ ماننا پڑیگا کہ نسخہ صحیح طور پر استعمال نہیں ہو رہا۔ روزہ کے متعلق قرآن کریم نے واضح طور پر بتا دیا کہ

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ ۲/۱۸۷

اے ایمان والو! تمہارے اوپر روزے فرض کئے گئے ہیں جیسے اُن لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو تم سے پہلے ہو گذرے ہیں۔ تاکہ تم تقویٰ شعار بنو

(۲) وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ۔

تاکہ جو کچھ تمہیں اللہ نے ہدایت کی ہے اس پر اس کی بڑائی کا اعلان کرو

(۳) وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ..... اور تاکہ تم شکر گذار بنو

یعنی روزے اس لئے فرض کئے گئے ہیں کہ (۱) تم تقویٰ شعار بنو (۲) شکر گذار بنو اور (۳) اللہ کے نام کی عظمت کو بلند کرو۔ اگر تمہارے روزوں سے یہ نتائج مرتب ہوتے ہیں تو سمجھ لو کہ روزے قرآنی منشار کے مطابق

رکھے جاتے ہیں اور اگر یہ نتائج برآمد نہیں ہوتے تو ہمارے اس عمل میں کہیں نقص رہ جاتا ہے۔

تقویٰ، تشکر اور تکبیر (خدا کے نام کی بڑائی) بڑے جامع الفاظ ہیں۔ جن کی تشریح قرآن کریم کے مختلف مقامات پر ملے گی۔ ان کے متعلق استیعاباً لکھنے کی تو گنجائش نہیں، چند اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ جن سے ہم یہ دیکھ سکینگے کہ ان خصوصیات کا مفہوم کیا ہے اور ان سے کس قسم کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

پہلے یہ دیکھئے کہ جب انسان میں تقویٰ پیدا ہو جاتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

(۱) اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ ۱۰/۶۳-۶۲

آگاہ رہو کہ یقیناً جو اللہ کے فرمانبردار ہیں اُن کے لئے نہ کسی قسم کا خوف ہوتا ہے نہ غمگینی۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ ایمان لائے اور تقویٰ شعار رہے۔

یعنی تقویٰ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کے دل میں کسی قسم کا خوف و حزن نہ رہے۔

(۲) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

اے ایمان والو! اگر تم خدا سے تقویٰ کی زندگی بسر کرو تو وہ تمھیں ایک امتیازی زندگی عطا کرے گا اور تم سے تمھاری برائیاں دور کر دے گا اور (تمھاری لغزشیں) معاف کر دیگا۔ اور اللہ تو بہت بڑا فضل کرنے والا ہے۔

یعنی تقویٰ کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ اس قوم کو ایک امتیازی زندگی عطا ہو۔ یعنی ایسی زندگی جس میں تمکن فی الارض حاصل ہو۔

(۳) وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاۗءُ ۭ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَاۗءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ ۱۲/۵۷-۵۶

اور اس طرح ہم نے یوسف کو تمکن فی الارض عطا فرمایا کہ جس جگہ چاہے حسب مرضی کام چلائے

ہم جسے چاہتے ہیں (اس طرح) اپنی رحمت سے نوازتے ہیں اور ہم نیک عملوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتے۔ اور جو لوگ ایمان لائے ہیں اور تقویٰ کی زندگی بسر کرتے ہیں ان کے لئے (اس کے علاوہ) آخرت کا اجر کہیں بہتر ہے۔

یعنی دنیا میں تمکن فی الارض اور آخرت میں جنت کی زندگی۔ یہ ہے تقویٰ کا لازمی نتیجہ۔ اور چونکہ روزوں کی مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں میں تقویٰ پیدا ہو اس لئے روزے ذریعہ ہیں اس مقصد کے حصول کا کہ مسلمانوں کو ایک امتیازی زندگی حاصل ہو۔ ایسی زندگی جس میں کسی قسم کا خوف و حزن نہ ہو۔ دنیا میں حکومت و تمکن حاصل ہو اور آخرت میں سرفرازی و سعادت۔

روزوں کی دوسری غایت یہ بتائی گئی ہے کہ تم شکر گزار بنو۔ (لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ) شکر بھی ایک جامع اصطلاح ہے جس کا قرآنی مفہوم سمجھانے کے لئے فرصت درکار ہے۔ مجملاً یوں سمجھئے شکر سے مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قوتوں اور نعمتوں کو اسی کے متعین فرمودہ مقاصد کے لئے صرف کرنا ان قوتوں اور نعمتوں کا شکر ہے۔ دنیا میں انسان کے لئے مال، اولاد اور جان عزیز ترین متاع ہیں۔ لیکن ایک عبدِ مومن ان میں سے کسی چیز کو بھی اپنی ملکیت نہیں سمجھتا۔ اس کا ایمان یہ ہے کہ یہ سب کچھ اللہ کی ملکیت ہے اور ایک وقتِ معینہ تک کیلئے اس کے پاس بطور امانت رکھا ہے۔ مالک کی طرف سے جب اشارہ پائے، وہ جہاں کہے انھیں لاکر حاضر کردے۔ یہ ہے شکر۔ لیکن خدا کے ہاں داد و ستد کے تو انداز ہی نرالے ہیں۔ مال، اولاد، جان سب کچھ اسی کا عطا فرمودہ ہے۔ اس لئے انھیں اپنے لئے لے کر کیا کرنا ہے۔ وہ ہم سے ہمارے ہی لئے لیتا ہے اور پھر انھیں دگنا۔ چوگنا۔ سات سو گنا کر کے ہمیں ہی واپس دے دیتا ہے۔ مال لیتا ہے کہ اسے صحیح طریق پر بڑھایا جائے۔ اور جان لیتا ہے تو اس لئے کہ موت کے بدلے حیات عطا فرمائے۔ سورۂ بقر کے بتیسویں رکوع میں بنی اسرائیل کے تذکرے میں اسی حقیقتِ عظمیٰ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جب فرمایا:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ
فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا
اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ
لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۭ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۠ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ ۲/۲۴۳-۲۴۵

کیا تم نے ان لوگوں کی سرگذشت پر غور نہیں کیا جو اپنے گھروں سے عین کھڑے ہوئے تھے اور باوجودیکہ ہزاروں کی تعداد میں تھے مگر (دلوں کی بے طاقتی کا یہ حال تھا) کہ موت کے ڈر سے بھاگ گئے تھے۔ (جب ان بزدلوں نے یوں ہمت ہار دی) تو اللہ کا حکم ہوا کہ (تم موت کے ڈر سے بھاگ نکلے ہو تو دیکھو) اب تمھارے لئے موت ہی ہے (یعنی ان کی بزدلی کی وجہ سے دشمن ان پر غالب آگئے۔ اور وہ زندگی سے محروم ہوگئے) پھر اللہ نے انھیں زندہ کر دیا۔ (یعنی عزم و ثبات کی روح ان میں عود کر آئی۔ اور دشمنوں کے مقابلے کیلئے کھڑے ہوگئے اور فتحمند ہوگئے) یقیناً اللہ انسان کے لئے بڑا ہی فضل رکھنے والا ہے۔ لیکن اکثر آدمی ایسے ہیں کہ وہ شکر گذار نہیں ہوتے۔ (شکر گذاری کا طریق یہ ہے کہ) اللہ کی راہ میں (جنگ پیش آجائے تو موت سے نہ ڈرو۔ بے خوف ہوکر) لڑو۔ اور یقین رکھو کہ اللہ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے (یہ جان کا شکر ہے اور مال کا شکر؟) کون ہے جو خدا کو خوش دلی کے ساتھ قرض دیتا ہے تاکہ خدا اس کا قرض دوگنا بلکہ سوگنا زیادہ ادا کرے (یاد رکھو) تنگی اور کشایش اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور اس کی طرف تم سب کو لوٹنا ہے۔

یہ تو بنی اسرائیل کے واقعہ کے ضمن میں فرمایا۔ خود مسلمانوں سے ارشاد ہوا کہ ذرا سوچو کہ مکی زندگی میں تمھاری کیا حالت تھی! پھر جب تم نے اللہ کا شکر ادا کیا یعنی اس کی عطا فرمودہ قوتوں کو اس کی راہ میں صرف کرنے کے لئے بدر و حنین کے میدانوں میں لا کھڑا کیا تو اس کے بعد حالت کیا سے کیا ہوگئی۔ فرمایا

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ
يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ
مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ ۸/۲۶

اور وہ وقت یاد کرو جب (مکہ میں) تمھاری تعداد بہت کم تھی اور تم ملک میں کمزور سمجھے جاتے تھے۔ تم اس وقت ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تمھیں اُچک کر نہ لے جائیں پھر اللہ نے تمھیں ٹھکانہ عطا فرمایا۔ اپنی نصرت سے قدرت بخشی اور اچھی چیزیں دے کر رزق کا سامان مہیا کر دیا۔ تاکہ تم شکر گذار ہو!

یعنی تقویٰ اور شکر گذاری ہی کا نتیجہ تھا کہ اس ضعف و ناتوانی کی زندگی کے بعد یہ شوکت و عظمت کی زندگی عطا فرمائی۔ اور اس شوکت و عظمت کو اس لئے عطا فرمایا گیا کہ ان قوتوں کو تم پھر اُسی کی راہ میں صرف کرو۔ یعنی (اگلی آیت ہے)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ ۸/۲۷-۲۸

مسلمانو! ایسا نہ کرو کہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت کرو۔ اور اپنی امانات میں بھی خیانت نہ کرو (یعنی مال۔ اولاد۔ جان جو تمھارے پاس بطور امانت رکھے گئے ہیں انھیں خدا کی راہ میں لاکر حاضر کرو) اور تم اس بات سے ناواقف نہیں ہو۔

اور یاد رکھو! تمھارا مال اور تمھاری اولاد (تمھارے لئے) ایک آزمائش ہے۔ یہ نہ بھولو کہ اللہ ہی ہے جس کے پاس بہت بڑا اجر ہے۔

روزے اس لئے فرض کئے گئے ہیں کہ تم شکر گذار بنو اور شکر گزاری کا عملی ثبوت یہ ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ جب اس طرح شکر کیا جائے تو اس کے نتائج وہی ہونگے جن کی تفصیل اوپر کی آیاتِ مقدسہ نے بیان کی ہے۔ یعنی ضعف و ناتوانی کی جگہ قوت اور صحت اور بے سروسامانی کی جگہ تمکن و تسلط۔ روزے انہی مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔

لیکن یہ قوت و ثروت۔ جاہ و حشمت۔ تمکن و تسلط۔ مال و متاع اس لئے نہیں کہ تم دنیا میں فرعونیت

اختیار کر جاؤ اور دوسرے انسانوں کو اپنا غلام بناؤ۔ بلکہ اس لئے کہ دنیا میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا غلام نہ رہے اور ابلیسیت اور فرعونیت کا خاتمہ ہو جائے۔ دنیا میں حکومت صرف اللہ کی قائم ہو۔ بڑائی صرف اسی ایک کے لئے رہ جائے اور کوئی بڑا نہ ہو۔ حکم اسی کا چلے۔ قانون اسی کا نافذ ہو۔ کبریائی اسی کے لئے وقف ہو جائے۔ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (تاکہ اللہ نے جو تمھیں ہدایت عطا فرمائی ہے تو تم اس پر اس کے نام کی بلندی قائم کرو)۔ یہ بڑائی کس طرح قائم ہوگی؟ اس کی تفصیل سورۂ حج میں ملاحظہ فرمائیے۔ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ کے بعد فرمایا:-

اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ۝

جو لوگ ایمان لائے ہیں یقیناً اللہ ان کی مدافعت (و محافظت) کرتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ امانت میں خیانت کرنے والوں کو کہ وہ کفرانِ نعمت کر رہے ہیں کبھی پسند نہیں کرتا۔

خدا کے نام کو بلند کرنے والوں۔ اس کی حکومت کو دنیا میں قائم کرنے والوں کے متعلق خدا کا یہ وعدہ ہے کہ وہ ان کی مدافعت کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ وہ (۱) اپنی امانات میں خیانت نہ کریں اور (۲) شکر گذار ہوں۔ یعنی وہی حضرات جن کا ذکر سورۂ انفال کی مذکورہ صدر آیاتِ جلیلہ میں آچکا ہے۔

یہ مدافعت کے سامان کیسے ہوتے ہیں؟ اگلی آیت میں فرمایا

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُۨ ۝ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ ۲۲/۳۹-۴۰

جن (مومنین) کے خلاف ظالموں نے جنگ کر رکھی ہے اب انھیں بھی جنگ کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور اللہ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے۔ یہ وہ مظلوم ہیں جو ناحق اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے صرف اس جرم کی پاداش میں کہ وہ کہتے تھے کہ اللہ ہمارا پروردگار ہے

اور دیکھو اگر اللہ بعض لوگوں کے ہاتھوں دوسروں کی مدافعت نہ کراتا رہتا تو کسی قوم کی عبادت گاہ زمین پر محفوظ نہ رہتی۔ خانقاہیں۔ گرجے۔ عبادت گاہیں مسجدیں جن میں کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے سب ڈھائے جا چکے ہوتے (یاد رکھو) جو کوئی اللہ (کے نظام) کی حمایت کرے گا ضروری ہے کہ اللہ بھی اس کی مدد فرمائے۔ کچھ شبہ نہیں یقیناً وہ قوت رکھنے والا۔ سب پر غالب ہے۔

لیکن یہ اجازت فقط مدافعت کے لئے نہیں بلکہ تمکن کے لئے ہے۔ اس تمکن کے لئے جس کا لازمی نتیجہ مظلوموں کی حفاظت حقیقی مساوات و حریت اور خدا کی عظمت و کبریائی کا اعلان ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ ۲۲/۴۱

یہ (مسلمان) وہ ہیں کہ اگر ہم نے دنیا میں انھیں صاحب اقتدار کر دیا تو وہ نماز (کا نظم) قائم کرینگے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی میں سرگرم رہینگے۔ معروف (یعنی احکام الٰہیہ) کا حکم دینگے اور منکر (یعنی نواہی) سے روکینگے اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ پہلے پہل یہ اجازت کب ملی اور اس پر عمل کس وقت ہوا تھا؟ جب پہلی مرتبہ رمضان کے روزے فرض ہوئے ہیں تو اس رمضان کی سترہ تاریخ کو بدر کے میدان میں حق و باطل کا یہ معرکہ رزم آرا ہوا اور وہاں مومنین کی اس تقویٰ شعار اور شکر گذار مٹھی بھر جماعت نے بتا دیا کہ روزوں کا مفہوم کیا ہے اور کس طرح اللہ کے نام کی بلندی کا اعلان کیا جاتا ہے! اور اس اعلان کا نتیجہ؟ وہی جو تقویٰ اور شکر گذاری کا نتیجہ بتایا گیا ہے! نہیں! بلکہ وہی جو روزوں کا نتیجہ بتایا گیا ہے۔ یعنی ایسی زندگی جس میں کسی قسم کا خوف و حزن نہ ہو، وہ زندگی جس میں اعتماد و سرفرازی حاصل ہو۔ وہ زندگی جس میں تمکن فی الارض ہو۔ غلبہ و حکومت کی زندگی۔ جاہ و حشمت کی زندگی۔ عزت و وقار کی زندگی۔ یعنی اس زمین پر خلافت الٰہیہ کی زندگی یعنی صحیح مومن کی زندگی۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ تمام مقاصد حیات اور ان کا حصول محض صدر اولیٰ کے مسلمانوں تک ہی محدود تھے؟ ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ اگر یہی صورت ہوتی تو پھر نہ قرآن کریم کی قیامت تک کے لئے ضرورت تھی نہ اس کی حامل جماعت کی

جب زندگی اور اُس کے تمام مسائل۔ حق و باطل کی کش مکش۔ خیر و شر کی آویزش اُس وقت تک باقی ہے جب تک دُنیا میں انسان موجود ہے تو پھر قرآن کریم کے اِن احکامات سے آج بھی وہی مفہوم ہے جو آج سے چودہ سو سال پیشتر تھا۔ اس نسخۂ جلیلہ کے نتائج آج بھی وہی مرتب ہونے چاہئیں جو قرنِ اوّل میں ہوتے تھے۔ لیکن کیا آج ایسا ہو رہا ہے؟ اس کا جواب کسی اور سے نہیں خود اپنے آپ سے پوچھئے! تین سو تیرہ نفوس۔ انہی نماز اور روزوں کے ذریعے ساری دُنیا پر چھا گئے۔ لیکن آج چالیس کروڑ سے زائد مسلمان ساری دنیا میں پھیلے ہوئے۔ نماز بھی پڑھتے ہیں اور روزے بھی رکھتے ہیں۔ لیکن خُدا کی یہ زمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ ہو رہی ہے! کیا نسخہ کے صحیح استعمال سے بیمار کی یہی حالت ہونی چاہیے تھی! لیکن مصیبت یہ ہے کہ مسلمان نے یہ سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے کہ قرآن کریم نے اعمال کے نتائج واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بیان ہی اس لئے کئے تھے کہ ہر شخص ہر زمانہ میں خود پہچان سکے کہ اس کے اعمال قرآنی معیار میں بھی پورے اُتر رہے ہیں یا نہیں! مسلمان نے آج یہ سمجھ رکھا ہے کہ یہ اعمال جو کبھی درحقیقت زندگی کے سرچشمے تھے محض چند رُسوم ہیں جن کی ادائیگی ضروری ہے۔ ورنہ اُن کا زندگی اور اُس کے مسائل سے کوئی علاقہ نہیں۔ باقی رہے نتائج۔ سو وہ "خدا کے ہاں" مرتب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ہم سے اُن کا کوئی واسطہ نہیں۔ وہ اُن رُسوم کی ادائیگی کے بعد سمجھ لیتے ہیں کہ خُدا کی طرف سے ان پر جس قدر فرائض عائد کئے گئے تھے وہ ادا ہو چکے۔ اس سے بڑی فریب خوردگی اور کیا ہو سکتی ہے!

یاد رکھئے: جب تک اعمال کو اِن نتائج سے نہیں پرکھیں گے یہ کبھی معلوم نہیں ہو سکیگا کہ اعمالِ قرآنی حکمتِ خداوندی کے مطابق ادا ہو رہے ہیں یا نہیں۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ دین و دنیا کی کامیابی و کامرانی انہی اعمالِ حیات کے اندر پوشیدہ ہے جو قرآنِ کریم کے ضابطۂ خداوندی میں متعین کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن یہ اعمال محض چند رُسوم نہیں ہیں زندگی کی ٹھوس حقیقتیں ہیں! رسمی طور پر قیامت تک ادا کرتے چلے جائیے۔ کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ نتیجہ اس وقت برآمد ہوگا جب یہ منشائے خداوندی کے مطابق ادا کئے جائینگے۔ جس کی عملی شکل "محمد رسول اللہ والذین معہٗ" کے نقوشِ قدم میں چمکتے ہوئے ستاروں کی طرح جگمگ جگمگ کر رہی ہے وفیھا بصائر للناس۔

—— ۲ ——

اکتوبر کی آخری تاریخوں (۲۶ و ۲۷) میں دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ اور کونسل کے اجلاس منعقد ہوئے

اجلاس کی روئداد کے لئے ہم نے اشاعت حاضرہ میں کچھ تاخیر گوارا کر لی۔ کونسل کی کارروائی اور اس کی قراردادیں، اخبارات کے ذریعے آپ تک پہنچ چکی ہونگی۔ لیکن ان ملی اجتماعات کے موقع پر ہماری نگاہیں کسی اور چیز پہ ہوتی ہیں۔ یہ بھانپتے رہتے ہیں کہ قوم میں صحیح جماعتی زندگی کی روح بھی سرگرم عمل ہے یا نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ روز بروز حالات بہتر ہوتے چلے جا رہے ہیں لیکن ہم ان میں سے نہیں ہیں جو اپنے آپ کو خواہ مخواہ فریب میں مبتلا رکھیں۔ اصل یہ ہے کہ ابھی من حیث الجماعت ہم حقیقی روح سے بہت دور ہیں۔ مسلم لیگ کی کونسل تمام مسلمانان ہند کے نمائندگان کی جماعت کا نام ہے اور اگر یہ قوم کی ذہنیت کا صحیح آئینہ قرار دی جا سکتی ہے تو معاف فرمائیے! ہم یہ عرض کرنے پر مجبور ہیں کہ ہماری ملی ذہنیت ہنوز بہت خام ہے۔ باستثنائے چند معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کوئی مسائل زیر نظر کو زندگی اور موت کے مسائل سمجھکر ان پر سنجیدگی سے غور و تدبر کی ضرورت سمجھتا ہے۔ سب سے زیادہ افسوسناک اور مایوس کن منظر گوشہ پنجاب کا تھا۔ اور اگر کہیں زندگی کے آثار نظر آتے تھے تو وہ ان گوشوں میں جنھیں اقلیت کے صوبے کہا جاتا ہے۔

لیکن اس تمام مایوسی و پژمردگی کے اندر امید کی ایک زندہ کرن اور زندگی کی ایک درخشندہ جھلک بھی موجود تھی۔ یعنی جناب جناح کی ذات گرامی۔ اللہ تعالیٰ کے انداز بالکل نرالے ہیں۔ وہ جب کسی سے کام لینا چاہتا ہے تو اس میں ایسی تبدیلی پیدا کر دیتا ہے جو کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتی۔ وہی جناح جس کی روح اور پیکر دونوں مغرب کے کارخانوں میں ڈھلے ہوئے نظر آتے تھے آج اس مقلب القلوب کے دست قدرت سے ایمان و ایقان کے ایک نئے سانچے میں ڈھل چکا ہے۔ دماغ، آئین و دساتیر کی ان بلندیوں تک پہنچا ہوا کہ جس کی مثال روز ویلٹ اور چرچل میں بھی مشکل مل سکے۔ اور اس کے ساتھ سینہ میں ایک ایسا نرم و گرم دل جو کبھی درد ملت سے لبریز۔ مثلاً ایران و دیگر ممالک اسلامیہ پر جب انقریہ کے لئے اٹھے ہیں تو معلوم ہوتا تھا کہ صحیح جذبات اسلامیہ کا ایک طوفان ہے جو امنڈا چلا آ رہا ہے۔ تدبر، جذبات اور کیریکٹر کا مجموعہ۔ یہ کسی کی کیا مجال کہ سامنے آنکھ بھی اٹھا سکے۔ مسئلہ ممالک اسلامیہ پر پنجاب کی طرف سے جس ذہنیت کا مظاہرہ ہوا وہ اخبارات میں آ چکا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ مخالفت کا یہ طوفان سب کو اپنے ساتھ بہا کر لے جائے گا۔ لیکن جب جناب جناح نے اپنی مختصر لیکن جامع تقریر کے بعد آواز کیلئے کہا تو ایک آواز بھی مخالفت میں نہ اٹھ سکی۔ یہ کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ جناح کے پاس نہ توپ ہے نہ تفنگ۔ نہ فوج ہے نہ پولیس۔ پھر یہ کیوں ہے کہ ان کے سامنے کسی کی آواز نہیں اٹھ سکتی؟ سبب بالکل واضح ہے۔ یہ سب اس لئے ہے کہ

جس کی آواز حق کی آواز ہوتی ہے اور اس سینے سے نکلتی ہے، جس میں اللہ کے سوا کسی اور کا ڈر نہیں۔ جناح کو نہ کوئی قوت مرعوب کر سکتی ہے نہ بڑے سے بڑا لالچ خرید سکتا ہے۔ یہ قوتِ ایمان ہے جس کے سامنے بڑی سے بڑی سرکش قوتیں ایک ثانیہ کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتیں۔ اے کاش! وہ پست ذہنیتیں جو اس کوشش میں رہتی ہیں کہ کسی طرح وہ جناح کی قوتوں کی مظہر بن جائیں اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ جناح کی قوت کا راز اس کے کیرکٹر کی بلندیوں میں ہے۔ حاشیہ نشینوں کی فریب رہ وار۔ واہ میں نہیں ہے۔

اس منظر کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو جناب فضل الحق کا مسئلہ تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ چونکہ فضل الحق صاحب اب کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لیے آگئے ہیں۔ اس لیے یہ مسئلہ آسانی سے سلجھ جائیگا۔ لیکن افسوس کہ آخری وقت پر آکر انھیں پھر غلط مشورہ دے دیا گیا۔ اور وہ دہلی سے باہر چار میل کے فاصلہ پر رک کر رہ گئے۔ اعصابی کمزوری والے انسان جب جذباتی طوفان میں گھر جاتے ہیں تو واقعی بیمار ہو جاتے ہیں۔ وہ جوں جوں دہلی کے قریب آتے جاتے تھے آنیوالے منظر کے تصور سے خون کی حرکت تیز ہوتی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ دہلی پہنچکر تیزیٔ حرکت حرارت میں تبدیل ہوگئی۔ لیکن یہ حرارت نہ تھی جو اجلاس میں آپ کی شرکت کی مانع ہوئی۔ بلکہ جیسا کہ انھوں نے خود دوسرے دن کہلا بھیجا۔ انھوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اجلاس میں ان کے متعلق بحث و تمحیص ان کی غیر حاضری میں ہو۔ ہمیں رہ رہ کر افسوس آتا ہے کہ انھیں کوئی بہتر مشیر مل سکا ورنہ وہ دنیا کے سامنے اس طرح مضحکہ نہ بن جاتے۔ ذرا اندازہ فرمایئے۔ وہ مسٹر جناح سے خود مل کر جاتے ہیں۔ ٹیلیفون پر گفتگو بھی ہوتی ہے۔ لیکن جو چٹھی لکھتے ہیں وہ مسٹر جناح کے نام نہیں۔ سکریٹری مسلم لیگ کے نام نہیں۔ بلکہ اپنے میزبان۔ خواجہ حسن نظامی صاحب کے نام لکھتے ہیں۔ جو اُسے مسٹر جناح تک پہنچاتے ہیں۔ بالکل بچوں کی سی باتیں۔ بچوں کی سی نہیں۔ عورتوں کی سی باتیں! اور چٹھی میں لکھتے کیا ہیں؟ یہ کہ میں کونسل اور ورکنگ کمیٹی کے استعفیٰ کا خط واپس لیتا ہوں اور ان الزامات کو بھی واپس لینے کے لیے تیار ہوں جو غلط اور جگر خراش تھے۔ لیکن ابھی نہیں۔ ذرا اس پر ٹھنڈے دل سے غور کر لوں اور اپنے رفقاء سے مشورہ بھی کر لوں۔ ملاحظہ فرمایئے! مہینہ بھر میں تو انھیں ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے لیے چند لمحات نہ مل سکے اور نہ ہی اپنے رفقاء سے مشورہ کرنے کی فرصت۔ کلکتہ سے اپنے رفقاء سمیت دہلی آ گئے۔ اور اس ایک مسئلہ کو سامنے رکھکر آئے۔ لیکن اس وقت تک سوچا ہی نہیں کہ

کو مجھے کیا کرنا ہے؟ کس قدر سوختہ بخت ہے وہ قوم جس کے ارباب حل وعقد کی دماغی اور قلبی کیفیت کا یہ انداز ہو اس کے برعکس جناب جناح کی کشادہ ظرفی اور بلند نگہی ملاحظہ فرمایئے۔ فضل الحق صاحب نے ان کی ذات کے خلاف الزامات لگائے تھے۔ وہ جناح جو کسی بڑے سے بڑے کی طرف سے ایک حرف بھی اپنے خلاف سننے کے لئے تیار نہیں ہوسکتا۔ مفاد ملی کی خاطر یہ سب کچھ سنتا ہے اور ماتھے پر شکن بھی نہیں آنے دیتا۔ قریب چار گھنٹے تک مجلس عاملہ کے سامنے یہ مسئلہ زیر بحث رہا۔ اور اس کے بعد خود مسٹر جناح نے اسے کونسل کے اجلاس میں پیش کیا۔ جس سکون و اطمینان اور شگفتگی و خندہ پیشانی سے انھوں نے اسے پیش کیا تھا۔ وہ ان کی بلندیٔ مقام کی آئینہ دار تھی۔ انھوں نے جماعت سے اپیل کی کہ وہ جناب فضل الحق صاحب کو ابھی اور مہلت دے کہ وہ ٹھنڈے دل سے معاملہ کو سوچ لیں۔ چنانچہ انھیں دس دن کی مزید مہلت دی گئی۔

ہم اپنے اس عزیز بھائی سے ایک بار پھر درخواست کرینگے کہ وہ اپنے آپ پر قابو رکھنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کریں۔ اور خود اپنی خاطر اور ملت اسلامیہ کے مفاد کلی کی خاطر جذبات کی رو میں بہ جانے کے مسلک سے اجتناب کریں۔ ہمیں امید واثق ہے کہ اس مزید مہلت کے وقفہ میں جناب فضل الحق اپنی روش میں اصلاح کرنے کے مسئلہ پر غور فرما کر اس فیصلہ پر پہنچ سکینگے جو خود ان کے لئے اور تمام مسلمانوں کے لئے سلامتی اور سعادت کی راہ کی طرف منجر ہوگا۔ اور اگر (خدانکردہ) وہ اپنی ضد پر اڑے رہے تو سوائے اس کے اور چارۂ کار کیا ہوگا کہ قوم اپنے آپ کو ان کی دیوانگی کے اثرات سے بچالے۔

---

(۳)

لکھنؤ سے ہمیں ادارۂ اقبال کے اغراض و مقاصد کی ایک مطبوعہ کاپی ملی ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ یہ ادارہ حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے عقیدتمند اور ہمارے جواں سال جواں ہمت محترم عبدالوحید خان صاحب (مصنف "جنگ آزادی اور مسلمانوں کا ایثار") ورکن کونسل آل انڈیا مسلم لیگ) کی دیرینہ آرزوؤں کا عملی پیکر ہے۔ حضرت علامہ اقبال کے پیغام کی نشر و اشاعت ادارہ کا مقصد اولین ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی ترقی و توسیع۔ عربی زبان کی ترویج

اور ہندوستان اور اسلامی ممالک کی تاریخ کی تحقیق و تدوین بھی ادارہ کے پیش نظر ہے۔ یہ مقاصد نہایت بلند اور پاکیزہ ہیں جن کی تکمیل کے لئے ادارہ کے سامنے پروگرام یہ ہے کہ ایک ماہ میں کم از کم ایک پمفلٹ شائع کیا جائے۔ مختلف مقامات میں جلسے وغیرہ کرکے مشہور اہل علم حضرات سے تقریریں کرائی جائیں یا مقالہ جات پڑھوائے جائیں۔ ایک مرکزی لائبریری قائم کی جائے۔ مختلف مقامات پر دار المطالع کھولے جائیں۔ دار التصنیف و دار الترجمہ قائم کیا جائے۔ اور ایک پندرہ روزہ پرچہ شائع کیا جائے۔

ادارہ کے مقاصد یقیناً اس قابل ہیں کہ ان کی تکمیل کے لئے ادارہ کی مدد کی جائے۔ اس کے لئے تفصیلی حالات۔ ناظم صاحب ادارہ۔ نعمت اللہ روڈ۔ لکھنؤ سے دریافت کیجئے۔

---

(۴)

الحمد للہ علیٰ ذالک کہ ملک کے اطراف و اکناف سے معارف القرآن کا استقبال اس گرم جوشی اور حسنِ عقیدت سے ہوا۔ جس کی توقع تھی۔ جس جس نے دیکھا ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور پڑھنے کے بعد والہانہ انداز سے خراجِ تحسین ادا کیا۔ یوں تو قارئینِ معارف القرآن میں سے ہر ایک کی رائے اپنی اپنی جگہ ایک خاص وقعت رکھتی ہے۔ لیکن ان میں ایک آواز ایسی ہے جو ہمارے نزدیک اس باب میں حرفِ آخر اور سند کا حکم رکھتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ آج ہندوستان کی علمی دنیا میں دو ہستیاں ایسی ہیں جن سے بڑھ کر قرآنی تحقیق میں شاید ہی کسی کا پایہ ہو۔ ایک شمس العلماء سید محب الحق صاحب اور دوسرے علامہ حافظ محمد اسلم صاحب جے راج پوری (اللہ تعالیٰ ان کے فیوض و برکات کو تا دیر سلامت رکھے) ان میں سے حضرت علامہ اسلم صاحب نے تو خود معارف القرآن پر بسیط مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔ رہے جناب شمس العلماء صاحب۔ سو ان کا گرامی نامہ (اصل مع نقل) طلوعِ اسلام کے صفحات پر شائع کرنے کا فخر حاصل کیا جاتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ فرما سکینگے کہ معارف القرآن کیا ہے! ہم جناب مؤلف (حضرت پیر دینؒ) کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی محنت کو اس طرح شرفِ قبولیت عطا

فرمایا ہے کہ اللہ کے ہاں کی قبولیت اس کے مقبول بندوں کی آواز کے ذریعے ہی پہچانی جایا کرتی ہے۔ ہمارے لئے یہی موجبِ صد افتخار و اعزاز ہے کہ اس عظیم المرتبت کتاب کی اشاعت کی سعادت ہمارے حصہ میں آئی ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی لکھا ہے یہ کتاب اس قابل ہے کہ درساً درساً پڑھی اور پڑھائی جائے۔ اگر ہمارے "اسلامیہ" مدارس (یعنی کالج) اسے اپنے ہاں بطور نصاب مقرر کرلیں تو آپ دیکھینگے کہ چند ہی سال کے عرصہ میں مسلمان طلباء کی ذہنیت میں کیا انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ فی الحقیقت اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے جس کی آج ہمارے نوجوانوں کے قلب و دماغ کو ضرورت ہے۔

لیتھو کی چھپائی میں کسی کتاب کا غلطیوں سے پاک وصاف رہ جانا ناممکنات میں سے ہے بظاہر یہ چیز کچھ تعجب انگیز سی نظر آتی ہے۔ لیکن جن احباب کو اس کا ذاتی تجربہ ہے وہ اس کی تصدیق کرینگے اور اس کی وجہ بھی بتا سکینگے۔ چنانچہ معارف القرآن بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتی تھی۔ اس میں بعض غلطیاں تو ایسی ہیں جو سطح پر تیرتی ہوئی نظر آجاتی ہیں۔ لیکن کچھ ایسی بھی ہیں جو ذرا گہرائی میں پہنچکر دکھائی دیتی ہیں۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ان غلطیوں کی فہرست مرتب ہو جائے۔ اگر غلطیاں زیادہ ہوئیں اور مخش۔ تو اغلاط نامہ شائع کر دیا جائے گا۔ ورنہ قارئین کی صحتِ ذوق پہ بھروسہ کرلیا جائے گا۔

---

(۵)

کاغذ کی گرانی کی وجہ سے ہم جن مشکل مراحل سے گذر رہے ہیں اُن کا تذکرہ اس سے پیشتر آچکا ہے۔ لیکن ان مراحل کی سختی روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہے۔ اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ بہرحال ہماری پوری کوشش ہوگی کہ ان مشکلات پہ قابو پاتے چلے جائیں لیکن

مشیت کو کیا منظور ہے۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ خدا کرے کہ طلوعِ اسلام کی کشتی نامساعد حالات کے اس گرداب سے صحیح وسلامت نکل جائے کہ طلوعِ اسلام کو اللہ کی ذات کے سوا کسی اور پر بھروسہ نہیں۔

اس چہار سالہ سفر میں ہمیں کس کس قسم کے تجارب حاصل ہوئے۔ اس وقت ہم ان کا تذکرہ قبل از وقت سمجھتے ہیں۔ شاید وقت آنے پر ان کا ذکر کر دیا جائے۔ تاکہ اس وادیِ جانگسل کے اور راہروان اس سے کچھ سیکھ لیں۔ البتہ ایک تلخ حقیقت کی طرف اشارہ ناگزیر ہو گیا ہے۔ یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ طلوعِ اسلام کس طرح جگرِ لخت لخت کو جمع کر کے دعوتِ مژگاں کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اس کے مقاصد کی نشر و اشاعت کا مؤثر ذریعہ وہ پمفلٹس ہیں جو اس کی طرف سے وقتاً فوقتاً شائع کئے جاتے ہیں۔ صورت یہ ہوتی ہے کہ تھوڑا بہت اثاثہ جو موجود ہو اسے پمفلٹس کی تیاری پر لگا دیا جاتا ہے۔ ان میں ہزارہا بلا قیمت تقسیم کئے جاتے ہیں اور باقی اتنی قیمت پر کہ جس سے اصل واپس آجائے۔ اس چکر سے نشر و اشاعت کا یہ سلسلہ قائم تھا۔ کچھ دنوں سے آپ نے دیکھا ہوگا کہ کوئی نیا پمفلٹ شائع نہیں کیا گیا۔ اس کی ایک وجہ تو کاغذ کی موجودہ ہولناک گرانی ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ افسوسناک سبب ایک اور ہے۔ اور وہ وہی جو ایک زمانہ سے بطور حقیقتِ ثابتہ چلا آتا ہے۔

کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

یعنی ہمارے اکثر "بہی خواہ" ایسے ہیں جنھوں نے طلوعِ اسلام کا لٹریچر لیا کہ اسے "خدمتِ ملی" سمجھ کر فروخت کریں گے۔ "دردِ ملی" ایک ایسا حربہ ہے جس کا نشانہ خطا نہیں جاتا۔ اس لئے ہم بھی اس کی زد میں آگئے۔ اب حالت یہ ہے کہ جتنا کچھ تھوڑا بہت سرمایہ پاس تھا وہ ان پمفلٹس پر لگ گیا۔ اور یہ پمفلٹس ان "خدامِ ملت" حضرات کے پاس جا پہنچے۔ وہاں سے نہ ان کی قیمت وصول ہوتی ہے نہ پمفلٹس ہی واپس آتے ہیں۔ تفصیل اس کی طویل ہے۔ مثال کے طور پر یہ ایک واقعہ کافی ہے۔

ان "خدام الملت" حضرات میں سے ایک صاحب پچاس روپے کا لٹریچر پروپیگنڈا کے لئے بلا قیمت لے گئے۔ اور اس کے ساتھ قریب ڈیڑھ سو روپیہ کے پمفلٹ قیمتاً فروخت کرنے کے لئے سال بھر سے اوپر ہوئے کو آیا۔ آج تک نہ ایک پائی لفقد وصول ہوسکی۔ نہ ایک پمفلٹ واپس ملا۔ خط پر خط لکھے جاتے ہیں۔ پیغامات پہنچائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ "خادم ملت والدین" دردِ ملی میں کچھ اس طرح نڈھال ہیں کہ کسی طرف توجہ دینے کا ہوش ہی نہیں۔ نتیجہ یہ کہ یہاں نشر و اشاعت کا سارا سلسلہ رُک گیا۔ اور وہ نہایت معتبر بنے آرام سے بیٹھے ہیں۔ یہ ایک واقعہ عرض کیا گیا ہے۔ اگر اس قسم کے تمام واقعات درج کئے جائیں تو آپ تفتیش بدیوار ہو جائیں۔ اب آپ سمجھے کہ قوم کی نیا ڈوب کیوں رہی ہے؟ طلوعِ اسلام صرف ایک کاغذ کی گرانی کے ہاتھوں ہی نالاں نہیں۔

بسیار شیوہا است بتاں را کہ نام نیست

معذرت

ہمارا اندازہ تھا کہ اس دفعہ رسالہ دو تین دن کی تاخیر سے شائع ہوگا۔ لیکن افسوس ہے کہ پریس کی مجبوریوں کی وجہ سے غیر متوقع طور پر تاخیر ہوگئی۔ ہمیں قارئین کی کاوش و تشویش کا احساس ہے۔ لیکن ہم اپنی مجبوریاں کہیں سے کہیں؟

بے قراری ہے کس قرار کے ساتھ
جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ

شاہ سیّد احمد شہیدؒ کی سیرت پر ایک اجمالی نظر[۵]

"پچھلے دنوں میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ حضرت شہید علیہ الرحمۃ کی سیرت کا مطالعہ کیا جس کے تاثرات بے ساختہ صفحۂ قرطاس پر آگئے، تاثرات کیا عقیدت کے آنسوؤں کے چند قطرے، جو بارگاہِ حضرت شہیدؒ میں بصد نیاز و احترام پیش کرتا ہوں۔" ضیا ر

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط

تم (اے مدعیانِ ایمان) بہترین قوم ہو جو نوعِ انسانی کے لئے پیدا کی گئی ہے (تمہارا فریضۂ حیات یہ ہے کہ) معروف کا حکم کرو اور منکر سے روکو!

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ط

اور اس طرح ہم نے تمہیں (اے مدعیانِ ایمان) بہترین قوم بنایا ہے تاکہ تم تمام نوعِ انسانی (کے اعمال) پر نگراں رہو اور رسول تمہارا نگراں ہو

قرآن کریم نے اپنی ان دو مختصر لیکن جامع آیاتِ مقدسہ میں مسلمان کی زندگی کا نصب العین واضح کر دیا ہے مسلمان "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے لئے مقرر کیا گیا ہے اس کے ساتھ ہی وہ "شہداء علی الناس" ہے یعنی تمام نوعِ انسانی کے اعمالِ حیات پر نگراں۔ ظاہر ہے کہ اس مقصدِ عظیم کے حصول اور اس فرضِ گرانبار کی تکمیل کے لئے زندگی کو کس قدر عملِ پیہم اور جہادِ مسلسل سے عبارت ہونے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ نے جو ان آیاتِ جلیلہ کے اولین مخاطب تھے، اپنی زندگیوں کو اس نصب العین کے حصول کے لئے اس جذب و دفنا سے وقف کیا کہ دُنیا نے مشاہدہ کر لیا کہ شہداء علی الناس کیسے ہوتے ہیں اور آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر کے فرائضِ زندگی کیا ہیں! اُن کی زندگی سرتاپا عمل تھی؛ اس میں ایک لمحہ بھی جمود و تعطل کا نہ تھا۔ نتیجہ یہ کہ وہی غریب اور نادار مسلمان جو ابھی تھوڑا ہی عرصہ پہلے مخالف قوتوں کے جور و استبداد کی وجہ سے مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے

---

[۵] یہ مضمون کم و بیش سید ابوالحسن صاحب ندوی کی کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" کے اقتباسات پر مشتمل ہے ۱۲

دس سال کی قلیل مدت میں اسی مکہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور اپنے رب کے موعودہ "الکوثر" کے حقدار قرار پائے۔ وہ نہ صرف عرب ہی کے مالک بنے بلکہ قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج بھی اُن کے قدموں میں آگرے، اور یہ سب کچھ اس سُرعت سے ہُوا کہ آج یہ تاریخ کا اہم ترین سوال بن گیا ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہوا کہ عرب کے امّی بدو اتنے تھوڑے عرصہ میں بے پناہ سیلاب کی طرح دُنیا کی وسعتوں پر چھا گئے؟

لیکن ترقی و عروج کی وہ حیرہ کن داستان شاید اس قدر حیرت انگیز نہیں جس قدر آج مسلمان کے زوال و پستی کی عبرت آموز کہانی حسرت انگیز ہے۔ دُنیا تو یہ پوچھتی ہے کہ وہ کیسے ہوا تھا اور ہم دُنیا سے پوچھتے ہیں کہ یہ کسطرح ہوگیا ہے آسمان کی بلندیوں سے ہم زمین کی پستیوں پر کس طرح آگرے؟ لیکن دوسروں سے پوچھنے والے اگر خود اپنے ہاں تھوڑا سا غور کریں تو اس گتھی کا سُلجھانا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ اس "ہبوط" کی وجہ ظاہر ہے کہ وہ دَورِ سعی و عمل جلد گزر گیا۔ خلافت ملوکیت میں بدل گئی اور اس کے ساتھ ہی ملوکیت کی تمام لعنتیں ایک ایک کر کے قوم پر مسلّط ہوگئیں۔ دربار پر ملوکانہ تکلفات چھا گئے، قلب و نظر پر عجمی تصورات غالب آگئے۔ فرصت کا زمانہ، فارغ البالی کے دن، کھانے پینے کے لئے فراوانی، نہ فکرِ فردا، نہ غمِ دوش، زندگی کا نصب العین ابیقوریت (Epicureanism) ارباب علم و فضل بالعموم اپنی اپنی مسندوں پر بیٹھے منطقیانہ موشگافیوں اور فلسفیانہ نکات آفرینیوں میں "مصروف عمل" ہوگئے۔ پہلے یہ تھا کہ اُدھر سے ارشاد ہوا کہ "قالَ اللّٰہُ تعالیٰ" اور اِدھر انہوں نے اپنے عمل سے اس قال کو حال کر دکھایا۔ اب یہ مسئلہ پیدا ہوگیا کہ جب اللہ کے متعلق لفظ قال (اس نے کہا) کا استعمال ہو تو اس قول کی ماہیت کیا ہوتی ہے؟ جو فرشتے اس "قولِ خداوندی" کے حامل ہوتے ہیں اُن کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ ملکۂ نبوت کسے کہتے ہیں؟ وحی کی کیا کیفیت ہے؟ وغیرہ ذالک۔

ان لفظی "مجاہدات" کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف قوم سینکڑوں فرقوں میں بٹ گئی اور دوسری طرف ان سے سعی و عمل کی صحیح اسلامی روح مفقود ہوگئی، انہوں نے سمجھ لیا کہ کسی مسئلہ کا حل دریافت کرنا سب سے بڑا جہاد ہے۔ کسی مناظرہ کے میدان میں فریقِ مخالف کو منطقی دلائل سے خاموش کر دینا سب سے گراں قدر عمل حسنہ ہے۔ جبر و قدر کے مسائل، تجسیم و تنزیہہ کے مسائل، قرآنِ کریم کے مخلوق و قدیم ہونے کے مسائل، ذات و صفاتِ باری تعالیٰ، نبوت، وحی، الہام، معجزات، ملائکہ، جنت، دوزخ، برزخ، حشر و نشر، غرضیکہ ایک ایک شعبہ اور عقائد کے ایک ایک گوشہ کے متعلق لفظی مباحث و جدل کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ چھڑا کہ کثرتِ تعبیر سے خوابِ پریشان ہوگیا۔ اور اب اسلام کی اس مسخ شدہ صورت سے فریفتگی اس امر پر منتج ہوئی

کہ ان نظری مسائل سے تلاعب ہی مسلمان کی زندگی کا مقصدِ وحید بن گیا، یہاں تک کہ اب ہمارے سامنے کسی کی "عظمت" کے ماپنے کا پیمانہ ہی یہی باقی رہ گیا ہے کہ دیکھیں اُس نے کس قدر کتابیں لکھیں؟ کون کون سے متنازع فیہ مسائل پر خامہ فرسائی کی؟ سلوک کے کون کون سے مقامات طے کئے؟ اور اس طرح مجاہد و شہید کا وہ مرتبۂ عظیم کہ جس کے متعلق خود خدا نے فرمادیا کہ "انہیں مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں" نظروں سے اوجھل ہوگیا "عظمت" کا یہ تصور اب مسلمان کے دل و دماغ پر کچھ اس طرح چھاگیا کہ وہ مجاہدین جنہوں نے سرفرازئ کلمۃ الحق کے لئے اپنی زندگیاں قربان کردیں تاریخ کے دُھندلے سے نقوش بنتے چلے گئے۔ کیونکہ وہ بوجھل تصنیفات کا انبار اپنے پیچھے نہیں چھوڑ گئے جو ہمارے مدارس میں "دین" کا نصاب بن کر ہمارے طالب العلموں کے دماغوں پر مستولی ہوجائے۔ اب ان مجاہدین کا تذکرہ، اگر خوش نصیبی سے کہیں تاریخ کے اوراق نے اپنے اندر محفوظ کرلیا ہے، تو وہیں محفوظ رکھا ہے۔ یہ تذکرے نہ کہیں ہمارے مکاتب کے حلقۂ درس و تدریس میں وجہِ انجلائے قلب و نگاہ بنتے ہیں اور نہ ہماری خانقاہوں میں باعثِ تزکیۂ نفس و بالیدگیٔ روح سمجھے جاتے ہیں۔ انہیں تاریخ کی "کہنہ داستانیں" سمجھ کر قصۂ ماضی قرار دیدیا جاتا ہے اور کبھی یہ تصور میں بھی نہیں آتا کہ یہی وہ داستانیں ہیں جن کے تصدق میں ہم آج دنیا میں ایک کلمہ گو کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں یہ "پرانے خیال" کی دُنیا کی حالت ہے۔ "جدید خیال" کے مسلمانوں کو دیکھا جائے تو وہ ان سے بھی دس قدم آگے ہیں۔ اُن کے سامنے یہ داستانیں آئیں تو وہ جھجکتے ہیں، تامل کرتے ہیں، مضطرب ہوتے ہیں کہ کہیں اُستادانِ مغرب میں سے کوئی بھانپ تو نہیں رہا۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح یہ ثابت کردیا جائے کہ یہ داستانیں (معاذ اللہ) ایک عہدِ رفتہ کی یادگار ہیں جب انسان نے ہنوز ذہنی ترقی نہیں کی تھی ان کی تمام عمر کی کوششوں کا ماحصل یہ ہوتا ہے کہ دنیا کو یہ بتادیا جائے کہ "اسلام" کو ان چیزوں سے کچھ واسطہ نہیں ان ٹکسالِ مغرب کے ڈھلے ہوئے مسلمانوں کو کون بتائے کہ جن چیزوں سے تم آج یوں نگاہیں جھکائے پھرتے ہو۔ یہی چیزیں ہیں جو دنیا میں کبھی تمہاری سرفرازی کا باعث بنی تھیں ؎

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے!
ترے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہئے

صدرِ اولیٰ کے مسلمانوں کو چھوڑ کر کہ وہ خوب سمجھتے تھے کہ اسلام کا مقصد کیا ہے اور اُن کی زندگی کا نصب العین

کیا۔ زمانۂ مابعد پر بھی نگاہ ڈالی جائے تو یہاں وہاں ایسی ایسی ہستیاں نظر آجائیں گی جنہوں نے اسلام کی اس حقیقتِ عظمیٰ کو پہچانا اور اتباعِ اسوۂ حسنہ میں اس کا عملی نمونہ اپنی زندگی کے کوائف میں پیش کرکے دُنیا کو دکھادیا کہ ؎

بے دست و پا تیم کہ ہنوز از دفورِ عشق
سودا ست در سرم کہ بساماں برابر ست

جلیل القدر ہستیوں میں سید احمد صاحب شہید علیہ الرحمۃ ہیں جو گو زمانہ کے لحاظ سے پیچھے لیکن مرتبہ کے لحاظ سے بہت آگے ہیں۔

رسول اللہ کا دُنیا میں ایک بہت بڑا کام اور آپؐ کی بعثت کا اہم مقصد حکومتِ الٰہی کا قائم کرنا اور دُنیا میں آسمانی نظام جاری کرنا تھا۔ جناب سید احمد صاحبؒ شہید کی حیاتِ طیبہ میں اتباعِ نبویؐ کی یہ حیثیت بہت نمایاں ہے اور اسی جوہر نے مشائخِ اُمّت میں اُن کا سر بہت اونچا کر دیا ہے۔

سید صاحبؒ علیہ الرحمۃ نے اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھا کہ حکومتِ الٰہی اور اسلامی نظام و قوانین و حدود کے اجرار اور ماحول کی تبدیلی کے بغیر اصلاح افراد کی کوششیں "کوہ کندن اور کاہ برآوردن" ثابت ہوں گی یعنی انہوں نے محسوس کر لیا کہ ضرورت فضا بدلنے اور جڑ مضبوط کرنے کی ہے۔ آپ اسی نقشہ پر کام کرنا چاہتے تھے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء راشدین نے کیا اور تجربہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ اور پائدار کامیابی اسی کو ہوئی اور قیامت تک اسلام کی ترقی کے لئے وہی نظامِ عمل ہے۔

اسلام صرف خواص کا مذہب نہیں کہ چند منتخب لوگوں نے اس پر عمل کر لیا اور اُن کے اعمال دوسروں کے کے لئے کفارہ ہوگئے۔ اسی طرح اسلام عیسائیت کی طرح چند عقائد و رسوم کا نام نہیں وہ زندگی کا نظام ہے، وہ زمانہ کی فضا طبیعت بشری کا مذاق اور سوادِ اعظم کا رنگ بدلنا چاہتا ہے اور عقائد کے ساتھ اخلاق و معاشرت۔ زندگی کے مقصد و معیار زاویۂ نظر اور انسانی ذہنیت کو بھی اپنے قالب میں ڈھالنا چاہتا ہے یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ اس کو مادّی و سیاسی اقتدار حاصل ہو۔ قانون سازی کا حق کسی انسان کو حاصل نہ ہو بلکہ صرف خدا کو ہو۔ اسلام کے مادّی اقتدار کا لازمی نتیجہ اس کا روحانی اقتدار ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ

وَنَھَوا عَنِ المنکر وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ہ

یہ (مظلوم مسلمان) وہ ہیں کہ اگر ہم نے انہیں زمین میں صاحبِ اقتدار کر دیا تو وہ نماز قائم کریں گے زکوٰۃ کی ادائیگی میں سرگرم ہوں گے نیکیوں کا حکم دیں گے، برائیاں روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے (الحج)

یہ ظاہر ہے کہ شرعی حکومت کے بغیر شریعت پر پورا عمل ہو نہیں سکتا۔ اسلام کا دنیا میں ایک مستقل نظام ہے جو حکومت پر موقوف ہے بغیر حکومت کے قرآنِ مجید کا ایک پورا حصہ ناقابلِ عمل رہ جاتا ہے۔ خود اسلام کی حفاظت بھی بغیر قوت کے ممکن نہیں۔

سید صاحب علیہ الرحمۃ کی پہلی خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے ایک ایسے دور میں جبکہ اسلام کا یہ مطمحِ نگاہ بالعموم نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا اس بھولے ہوئے سبق کی یاد دلائی خود اس پر عمل پیرا ہوئے اور اس کے بعد دوسروں کو اس کی دعوت دی۔

اس کے بعد سید صاحبؒ کی ایک اور خصوصیت پر نظر ڈالئے یعنی اُن کا جذبۂ عمل اور اس کا حلقۂ اثر و نفوذ۔ آپ نے تھوڑے سے عرصہ میں ایک دینی فضا قائم کردی اور ایک ایسی جماعت پیدا کردی جو خود اُن کے رنگ میں رنگی ہوئی اور اُن کے مشن کی صحیح علمبردار تھی۔ سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے، ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے، اللہ کے لئے جان دینے والے، شریعت پر جینے اور مرنے والے، بدعت سے نفور، شرک کے دشمن، جہاد کے نشہ میں سرشار، تقویٰ و عبادت کے صحیح مفہوم سے لذت آشنا اور بڑی بات یہ کہ ہم رنگ و یک آہنگ، تاریخِ اسلام میں کسی ایک مقام پر اتنی بڑی تعداد میں اس پختگی اور جامعیت کی جماعتیں کہیں کہیں نظر آئیں گی جو اس طرح منظم اور وسیع ہوں اور جن کے انقلابی اور روحانی اثرات اتنے ہمہ گیر اور دوررس ہوں۔ مشرقی بنگالہ سے لیکر افغانستان کے حدود تک لاکھوں مسلمان اس تحریک سے وابستہ تھے۔ بنگال کے کمشنر پولیس کی رپورٹ ہے کہ اس جماعت کے ایک ایک مبلغ کے پیروؤں کی تعداد اسی اسی ہزار تھی۔ سر ولیم ہنٹر اپنی کتاب "مسلمانانِ ہند" میں لکھتا ہے۔

"صوبۂ متحدہ کے ایک انگریز کارخانہ دار نیل کا بیان ہے کہ اس کے دیندار مسلمان ملازم اپنی تنخواہ یا مزدوری کا ایک جزو ستھانہ کیمپ کے لئے علیحدہ کر کے رکھ لیتے تھے۔ جو لوگ زیادہ جری تھے وہ تھوڑے

بہت زمانہ کے لئے سقانہ جاکر خدمت کرتے تھے۔ جس طرح ہندو ملازم اپنے بزرگوں (پرکھوں) کے شرادھ کے لئے چھٹی مانگتے تھے اسی طرح مسلمان ملازم یہ کہہ کر چند ماہ کی رخصت لیتے تھے کہ اُنہیں فریضۂ جہاد ادا کرنے کے لئے مجاہدین کے ساتھ شریک ہونا چاہئے"

مندرجہ بالا تمہیدی سطور کے بعد پیشتر اس کے کہ ہم سید صاحبؒ کی زندگی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تیرہویں صدی یعنی سید صاحبؒ کے زمانہ کے ہندی مسلمانوں کا بھی کچھ ضمنی تذکرہ کر دیا جائے۔

مذہبی طور پر مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں اسلام ایران و افغانستان کا چکر کاٹ کر پہنچا اور راستہ میں اپنی بہت سی تازگی اور زندگی کھو کر یہاں تک آیا، پھر جس ملک میں وہ داخل ہوا اس کا خود ایک مذہب، ایک تصوف اور ایک تہذیب تھی۔ جس وقت حریفوں کی تلواریں آپس میں میدانِ جنگ میں دست و گریباں ہوتی تھیں اس وقت ان کی تہذیبیں استفادہ و تعارف میں مشغول ہوتی تھیں۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ بقول ڈاکٹر لیبان "اسلام ہندوستان میں جتنا اثر انداز ہوا اُس سے زیادہ متاثر ہوا اور تھوڑے دنوں میں ایک بین الاقوامی عربی، ایرانی، افغانی، ہندوستانی امتزاجی مذہب و تہذیب پیدا ہوگئی، یہاں کے اسلام میں وہ ساری کمزوریاں تھیں جو ایران و افغانستان کے اسلام میں تھیں اور وہ بھی جو ہندو مذہب و تہذیب و تصوف کے اختلاط سے پیدا ہوئی تھیں جو لوگ یہاں اپنے پرانے مذہب سے اسلام میں داخل ہوئے وہ طبعاً اپنے ساتھ اپنی بہت سی مذہبی و قومی خصوصیات، عقائد اور خیالات لائے جو قائم رہے اور بعد میں مذہب میں داخل ہوگئے۔

اس زہر کا تریاق **قرآن** تھا۔ لیکن مرورِ زمانہ سے وہ صرف "ثواب حاصل کرنے" کا ذریعہ بن کر رہ گیا تھا۔ اس پر عمل تو کجا۔ اُسے اپنی زبان میں سمجھانے کی کوشش بھی "کفر" سے کم نہ سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ جب ہندوستان میں سب سے پہلا قرآنِ کریم کا ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمۃ نے فارسی میں کیا تو علماء میں قیامت برپا ہوگئی۔ یہاں تک کہ شاہ صاحبؒ کو کچھ دنوں کے لئے ہندوستان چھوڑ کر باہر جانا پڑا۔

تیرھویں صدی کے مسلمانوں کے مذہبی رجحانات کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ شرک و بت پرستی عام تھی۔ قبروں اور مُردوں کے متعلق ایک مستقل "شریعت" بن چکی تھی جس کے واجبات اور مستحبات میں وہ سب کچھ داخل ہو چکا تھا جسے ایک عبدِ مومن دیکھتا تو سمجھ نہ سکتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کس دین کی رُو سے ہو رہا ہے۔

سنت و شریعت بے معنی الفاظ تھے۔ بدعت کی تعریف کسی چیز پر صادق نہیں آتی تھی، اور ہر بدعت بدعت حسنہ تھی، بہت سے حرام حلال ہو گئے تھے اور بہت سے حلال حرام۔ اسلامی شعائر اُٹھ رہے تھے اور اُن کی جگہ ہندوانہ شعائر لے رہے تھے اور لے چکے تھے، فرائض و عبادات سے عام غفلت تھی۔ اسلامی معاشرت کے زوال و انحطاط کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ معتبر لوگوں کی شہادت ہے کہ سلام مسنون کی رسم سارے ہندوستان سے اُٹھ گئی تھی اور اس کی جگہ آداب عرض و تسلیمات کا رواج تھا۔

اخلاقی حالت یوں تھی کہ فسق و معصیت ان کی آداب و تہذیب میں داخل ہو کر معاشرت کا جزو بن گئی تھی، شراب نوشی عام تھی، نشہ آور چیزوں کا استعمال گھر گھر تھا۔

سیاسی حالت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ کسی حکومت کا زوال کہنے کو تو دو لفظ ہیں لیکن کسی ملک و قوم کی تاریخ میں قیامت سے کم نہیں، مسلمانوں کی سیاسی ساکھ گر چکی تھی اور اب وہ اپنے باپ دادا کی زمین پر نکما بوجھ بن کر رہ گئے تھے۔

تشتت و افتراق اور شرک و بدعت کے ایسے دور میں صفر کے مہینے میں ۱۲۰۱ھ میں جناب سید احمد شہید علیہ الرحمۃ کی پیدائش ہوئی۔

ابتدائی زندگی چار سال کی عمر میں شرفاء کے دستور کے مطابق آپ مکتب میں بٹھائے گئے لیکن لوگوں نے تعجب سے دیکھا کہ آپ کی طبیعت خاندان کے اور لڑکوں اور اپنے ہم عصروں کے برخلاف علم کی طرف راغب نہیں۔ بڑی مشکل سے قرآنِ مجید کی چند سورتیں یاد ہو سکیں، اور مفرد و مرکب الفاظ لکھنا سیکھ سکے۔ البتہ آپ کو بچپن میں کھیل کا بڑا شوق تھا خصوصاً مردانہ اور سپاہیانہ کھیلوں کا۔ کبڈی بڑے شوق سے کھیلتے اور اکثر لڑکوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیتے اور ایک گروہ دوسرے گروہ کے قلعہ پر حملہ کرتا اور فتح کرتا۔ اس طرح غیر شعوری طور پر آپ کی جسمانی و فوجی تربیت خود بخود ابتدائی مراحل طے کر رہی تھی۔

جب سنِ بلوغ کو پہنچے تو آپ کو خدمتِ خلق کا ایسا ذوق پیدا ہوا کہ اچھے اچھے بزرگ و خدا پرست انگشت بدنداں رہ گئے، ضعیفوں، اپاہجوں اور بیواؤں کے گھروں پر دونوں وقت جاتے، ان کا حال پوچھتے اور ان کے ادنیٰ سے ادنیٰ کام کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتے، وہ لوگ آپ کے بزرگوں کے مرید تھے اس لئے وہ اکثر کہتے کہ میاں کیوں

گنہگار کرتے ہو لیکن یہ باصرار اُن کی ضرورتیں معلوم کرتے اور بازار سے اُن کے لئے سودا وغیرہ لاتے۔ اس کے ساتھ ہی آپ کو عبادت و ذکرِ الٰہی کا بے حد ذوق تھا۔ رات کو تہجد گزاری اور دن کو خدمت گزاری اور تلاوت و دعا و مناجات میں مشغول رہتے قرآنِ مجید میں تدبر فرماتے اور یہی آپ کا مشغلہ تھا۔

آپکا ابتدائی شوقِ جہاد اور والدہ کا ایثار

ایسی مائیں دُنیا میں بہت کم ہوں گی جو بیٹے کی جان کے امتحان میں پوری اُتریں اور اُس کو مرنے کے لئے اپنے ہاتھ سے رخصت کریں۔ سیّد صاحبؒ کو اللہ نے والدہ بھی ایسی دی تھیں جو حضرت اسمٰعیلؑ کی نمونہ تھیں۔ تاریخ احمدی میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ ایک مرتبہ ایک مقام پر کفر و اسلام میں جنگ ہو گئی۔ سیّد صاحبؒ نے جانے کی آمادگی ظاہر کی لیکن کھلانے والی نے کسی طرح جانے نہ دیا۔ والدہ محترمہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ سیّد صاحب منتظر کھڑے تھے کہ آپ سلام پھیریں تو جانے کی اجازت طلب کریں۔ آپ نے جب سلام پھیرا تو دایہ سے کہا بی بی تمہیں ضرور احمدؒ سے محبت ہے مگر میری طرح نہیں ہو سکتی۔ یہ روکنے کا موقعہ نہ تھا، جاؤ بھیّا اللہ کا نام لے کر جاؤ مگر خبردار پیٹھ نہ پھیرنا ورنہ تمہاری صورت نہ دیکھوں گی، آپ گئے تو فساد رفع ہو گیا اور فریقین میں صلح ہو گئی۔

آپکی ورزشیں

اللہ تعالیٰ جس سے جو کام لینا چاہتا ہے اس کے لئے اس کا سامان اور شوق پیدا کر دیتا ہے اور اسی قسم کی اس کی تربیت فرماتا ہے۔ چنانچہ آپ کی توجہ بہت زیادہ جسمانی تربیت کی طرف تھی۔ آپ کی عادت تھی کہ سورج نکلنے کے گھنٹوں بعد تک ورزش و کشتی میں مشغول رہتے۔ کسی بچہ کو پیروں پر کھڑا کر کے پانچسو ڈنڑ لگاتے پھر کچھ ٹھہر کر پانچسو اور۔ اور من بھر، تیس سیر اور بیس سیر کے مگدر ہلاتے اس میں تعداد نہیں گنتے تھے بلکہ وقت کا اندازہ تھا مثلاً دو گھنٹے تین گھنٹے چار گھنٹے۔

پیرنے اور پانی میں ٹھہرنے کی آپ نے بڑی مشق بڑھائی تھی سخت بہاؤ میں بہاؤ کے خلاف پیرتے۔

جب آپ جوان ہو چکے اور والدہ کا انتقال ہو گیا تو آپ تحصیلِ معاش کی خاطر اپنے چند عزیزوں کے ساتھ لکھنؤ گئے کچھ عرصہ وہاں ٹھہر کر آپ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں دہلی حاضر ہوئے۔ سیّد صاحب جب شاہ صاحبؒ کی خدمت میں پہلی مرتبہ حاضر ہوئے تو نہایت سادگی میں السلام علیکم کہا جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے یہ وہ زمانہ تھا جب سلام مسنون کا رواج بھی ہندوستان سے جاتا رہا تھا۔ حتیٰ کہ شاہ صاحبؒ کے خاندان میں بھی اس کی رسم نہ تھی۔

شاہ صاحبؒ نے سید صاحب کا سلام سنا تو بہت خوش ہوئے۔ اور آپ نے حکم دیا کہ آئندہ سلام بطریق مسنون کیا جائے۔

تعلیم تصورِ شیخ اور سیّد صاحب کا عذر

تعلیم سلوک کے ضمن میں حضرت شاہ صاحبؒ نے حسبِ معمول تصورِ شیخ کی تعلیم کی۔ سید صاحب نے نہایت ادب سے عرض کیا کہ حضرت اس میں اور بت پرستی میں کیا فرق ہے اس میں صورت سنگی یا قرطاسی ہوتی ہے اور اس میں صورت خیالی، جو تہ دل جگہ پکڑ لیتی ہے اور اس کی طرف توجہ اور اس سے استعانت ہوتی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے حافظؒ کا یہ شعر پڑھا ؎

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید

کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا!

سید صاحب نے فرمایا اگر مے نوشی کا حکم ہو جو گناہِ کبیرہ ہے تو اس کی تعمیل ہو سکتی ہے لیکن شرک نہیں ہو سکتا۔ شاہ صاحبؒ نے یہ سن کر سید صاحب کو فرطِ خوشی سے گود میں لے لیا اور مسرت و جوش سے کئی مرتبہ بوسہ دیا اور فرمایا اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل و انعام سے تم کو ولایت انبیاء سے نوازا ہے۔

کچھ عرصہ کی تعلیم کے بعد آپ رائے بریلی واپس آئے۔ کچھ مدت وطن میں ٹھیرے پھر دہلی آئے اور یہاں سے نواب امیر خاں کے پاس چلے گئے۔

نواب امیر خاں

نواب میر خاں جو بعد میں نواب امیر الدولہ خاں بہادر والیِ ریاست ٹونک ہوئے سنبھل ضلع مراد آباد کے ایک منچلے افغانی شریف زادے اور سپاہی تھے جنہوں نے اپنی لیاقت اور تدبیر سے ایسی قوت و جمعیت فراہم کر لی تھی جس کو ہندوستان کی سیاست میں کوئی قوت آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتی اور اگر حالات سازگار رہتے اور ان کی جماعت میں تفریق نہ ڈالدی جاتی تو وہ ہندوستان میں نہایت اہم عنصر ہوتی، سید صاحبؒ نے اُن کو باکار آدمی سمجھا اور خیال کیا کہ ان کی معیت و امداد سے کچھ کام ہو سکتا ہے۔ سید صاحبؒ کا یہ خیال غلط نہ تھا اور اگر بعض مجبوریاں نہ ہوتیں تو جو کام بعد میں ہوا پہلے ہو سکتا تھا، پھر بھی آپ کا وہاں رہنا خود آپ کے لئے اور اہلِ لشکر کے لئے فائدے سے خالی نہ تھا بہت سے لوگوں کی روحانی تربیت اور اصلاح ہو گئی۔

سید صاحبؒ نواب صاحب مرحوم کے لشکر میں چھ سال سے زاید رہے آپ کا یہ زمانہ پوری شغولیت کا تھا۔ رات کی عبادت اور دن کی مشقت سے پیروں پر ورم آجاتا لیکن آپ اپنے مقصد سے غافل نہ تھے آپ نواب صاحب کو

کو صحیح مشورے اور قیمتی امداد دیتے رہتے آخر یہ صحبت اس واقعہ پر ختم ہوگئی کہ مادھوراجپورہ پر فوج کشی کے سلسلہ میں دشمن سے صلح کرلینے کا مشورہ ہوا۔ سید صاحبؒ اس کے مخالف تھے آپ کا مشورہ جنگ جاری رکھنے کا تھا مصالحت کو کسی طرح مناسب نہ سمجھتے تھے خود نواب صاحب کی یہی خوشی تھی مگر لشکر کی بے سروسامانی اور اہل لشکر کی خودغرضی اور نااتفاقی کا عذر کرتے تھے۔ سید صاحب فرماتے کہ مصالحت کے بعد تم کچھ نہ کرسکوگے۔ لیکن نواب صاحب مصالحت میں ہی مصلحت دیکھتے تھے۔ انہوں نے اس کی تیاری کی سید صاحبؒ نے کہا اچھا آپ کفار سے ملتے ہیں میں رخصت ہوتا ہوں۔ چنانچہ آپ نواب صاحب سے رخصت ہوکر دہلی آگئے۔

چونکہ اب آپ کو اپنے زہد وتقوی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مقبولیت عام عطا فرمائی تھی اس بار آپ کا دہلی آنا لوگوں کے اشہب شوق وعقیدت کے لئے ایک مہمیز ہوا۔ اور لوگوں نے جوق درجوق آپ کی زیارت کے لئے آنا شروع کیا یہیں مولانا عبدالحیؒ اور مولانا اسماعیلؒ صاحب کہ خاندان ولی اللہی کے چشم وچراغ تھے آسمان علم وفضل کے مہر وماہ تھے آپ سے بیعت ہوئے اور اس طرح آپ کو زندگی کے دو بہترین رفیق ملے جنہوں نے آخر دم تک آپکا ساتھ نہ چھوڑا۔

زماں بعد آپ مختلف شہروں دیہات وقصبات سے ہوتے ہوئے جہاں ہزارہا لوگ آپ سے فیض یاب ہوتے وطن واپس آئے یہاں آپ کے معمولات درس وتدریس کے علاوہ لوگوں کو محنت ومشقت کی ترغیب وتربیت پر مشتمل تھے۔

عسکری تربیت ومشاغل

پنجاب میں مسلمانوں کی حالت نہایت گری ہوئی تھی، سکھوں کا راج تھا اور مسلمانوں کی عزت وآبرو اور جان غیر محفوظ تھی۔ سید صاحب اُن کی مظلومی پر کڑھتے اور جہاد کی ضرورت کے احساس کو نہاں خانۂ دل میں پرورش فرماتے، یہ کانٹا آپ کو ہمیشہ بے چین رکھتا، آپ کو دن رات اسی کا خیال رہتا، زیادہ تر یہی مشاغل بھی رہتے آپ اکثر اسلحہ لگاتے تاکہ دوسروں کو اسکی اہمیت معلوم ہو اور شوق ہو، بدقسمتی سے بہت سے مسلمان ان چیزوں کو تقدس ومشیخت کے خلاف سمجھتے تھے۔ لکھنؤ میں ایک مرتبہ جب آپ قندھاریوں کی چھاؤنی میں تشریف لے جارہے تھے آپ ہتھیار باندھے ہوئے تھے اور وہ لوگ بھی جو آپ کے ساتھ تھے کہ ایک صاحب عبدالباقی خاں نے یہ دیکھ کر کہا کہ "حضرت آپ کی سب باتیں تو بہتر ہیں مگر ایک بات مجھ کو بہت ناپسند ہے اور وہ بات آپ کے خاندان والاشان کے خلاف ہے۔ آج تک یہ طریقہ کسی نے اختیار نہیں کیا آپ کو وہی کام زیبا ہے جو آپ کے حضرات آباواجداد کرتے آئے"۔ آپ نے فرمایا وہ کونسی بات ہے کہا یہ سپر، تلوار، بندوق وغیرہ باندھنا۔ یہ اسباب جہالت ہیں یہ آپ کو نہ چاہئے" یہ سنتے ہی سید صاحب

کا چہرہ غصہ کے مارے سرخ ہو گیا اور فرمایا کہ خاں صاحب اس بات کا آپ کو کیا جواب دوں اگر سمجھئے تو یہی کافی ہے کہ یہ وہ اسباب خیر و برکت ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو عنایت فرمائے تاکہ کفار و مشرکین سے جہاد کریں خصوصاً ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی سامان سے تمام کفار و اشرار کو زیر کر کے جہان میں دین حق کو رونق بخشی اگر یہ سامان نہ ہوتا تو تم نہ ہوتے اور اگر ہوتے تو خدا جانے کس دین و ملت میں ہوتے "

آپ کو سب سے زیادہ جہاد کا خیال رہتا تھا جس کو مضبوط و توانا دیکھتے فرماتے کہ یہ ہمارے کام کا ہے اسے لو جب فنون حرب کی مشق و تعلیم میں زیادہ انہماک ہوا اور زیادہ تر وقت اسی میں صرف ہونے لگا یہاں تک کہ سلوک کے کاموں میں کمی ہونے لگی تو رفقاء نے آپس میں باتیں کرنی شروع کیں اور مشورہ کیا کہ مولانا محمد یوسف صاحب پہلی اس بارے میں سید صاحب سے گفتگو کریں اور جماعت کے خیالات کی اطلاع دیں۔ مولانا نے سید صاحب سے عرض کیا۔

سید صاحبؒ نے آپ کو جواب دیا کہ " ان دنوں دوسرا کام اس سے افضل ہم کو درپیش ہے اس میں ہمارا دل مشغول ہے یہ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے تیاری ہے۔ اس کے سامنے اس حال کی کچھ حقیقت نہیں وہ کام یعنی تحصیل علم سلوک اس کام کے تابع ہے۔ اگر کوئی تمام دن روزے رکھے اور تمام دن زہد و ریاضت میں گزارے اور نوافل پڑھتے پڑھتے پیروں پر ورم آجائے اور دوسرا شخص جہاد کی نیت سے ایک گھڑی بھی بارود اڑائے تاکہ کفار کے مقابلہ میں بندوق لگاتے آنکھ نہ جھپکے تو وہ عابد اس مجاہد کے رتبہ کو ہرگز نہیں پہنچ سکتا اور وہ کام (سلوک و تصوف) اس وقت کا ہے جب اس کام (تیاری جہاد) سے فارغ البال ہو۔ اور اب جو پندرہ سولہ روز سے دوسرے انوار کی ترقی نماز یا مراقبہ میں معلوم ہوتی ہے وہ اسی کاروبار کے طفیل سے ہے کوئی بھائی جہاد کی نیت سے تیر اندازی کرتا ہے۔ کوئی بندوق لگاتا ہے کوئی پھری گرکھیلتا ہے کوئی ڈنڑ پیلتا ہے اگر ہم اس کام کی اس وقت تعلیم کریں تو ہمارے یہ بھائی اس کام سے جاتے رہیں۔ یوسف جی تم خود اپنا حال دیکھو کہ گردن ڈالے ہوئے ایک عالم سکوت میں رہتے ہو اسی طرح اور لوگ ہیں کوئی کمل اوڑھے مسجد کے کونہ میں بیٹھا ہے کوئی چادر لپیٹے حجرہ میں بیٹھا ہے کوئی جنگل جا کر مراقبہ کرتا ہے کوئی ندے کنارے گڑھا کھود کر بیٹھا رہتا ہے ان صاحبوں سے تو جہاد کا کام ہونا مشکل ہے تم ہمارے بھائیوں کو سمجھاؤ کہ اب اس کام میں دل لگائیں یہی بہتر ہے۔

سید صاحب کی اب ایک اہم فریضہ کی طرف توجہ ہوئی یعنی ادائیگی حج۔ حج عرصہ سے علماء کی تاویلوں۔ فقہی موشگافیوں اور عوام کی غفلتوں سے متروک ہو گیا تھا۔ حج بہت سی مناسبتوں سے جہاد کا بھی ایک مقدمہ ہے۔

سید صاحب جن کو اللہ تعالیٰ نے اور شعائر اسلامی کو زندہ کرنے کے لئے پیدا کیا تھا فرائض کو کس طرح زندہ نہ کرتے ۔ چنانچہ آپ نے حج کی تیاری کی ۔ اور تیاری کیا کی "دو نیت کی" جماعت کو اطلاع دی، اہل خاندان کو شوق دلایا اور جہاں جہاں سید صاحب کے متعلقین تھے ان کو خطوط لکھوائے کہ ہم حج کو جاتے ہیں جو ہمارے ساتھ چل سکے، چلے ۔ سارے ہندوستان میں اس کی شہرت ہو گئی کہ سید صاحبؒ حج کو جاتے ہیں ۔ چنانچہ لوگوں کے خطوط و وفود آنے شروع ہو گئے ۔ اور یکم شوال ۱۲۳۶ھ عید کے روز نماز کے بعد چار سو آدمیوں سمیت آپ عازم حج ہوئے ۔ پہلے ڈلمؤ گئے وہاں سے کلکتہ ۔ سینکڑوں آدمی اور شریک ہوئے ۔ اور مجاہدین کا یہ لشکر جرار سرزمین حجاز کی طرف روانہ ہوا ۔ اور ۲۹ شعبان ۱۲۳۹ھ دو سال گیارہ مہینہ کے بعد فریضہ حج سے فارغ ہو کر وطن پہنچے ۔

اب یہاں سے سید صاحبؒ کی زندگی کا دوسرا اہم باب شروع ہوتا ہے جس کا ذکر آئندہ صحبت میں کیا جائے گا۔

رمزِ غلامی

جلسۂ قومی میں آزادی پہ تقریریں ہوئیں
سُن کے حیراں ہو رہی تھی ایک مسجد کی امام

اُس جگہ تو لب کشائی کا نہ تھا موقع مگر
اپنی مسجد میں پہنچ کر یُوں ہوئے گرم کلام

اے محلّے کے مسلمانو! یہ دیکھو تو سہی
رہبرانِ قوم کے سر میں ہے کیا سودائے خام

شور برپا کر رہے ہیں یہ غلامی کے خلاف
چاہتے ہیں ملک میں اپنی حکومت کا قیام

آہ، یہ رمزِ غلامی سے ذرا واقف نہیں
ورنہ بھولے سے کبھی لیتے نہ آزادی کا نام

"اَنتُمُ الاَعلَونَ" آیا ہے ہماری شان میں
ہم سے بڑھکر ہو نہیں سکتا کوئی عالی مقام

حکمراں کہتے ہیں جنکو وہ تو خدمتگار ہیں
اہلِ دیں کیواسطے کرتے ہیں جو دنیا کے کام

ہم اگر اجمیر و کلیر کی زیارت کو چلیں
اُنکے ذمّے ریل گاڑی کا مناسب اہتمام

فرض ہے ہم پر نماز و روزہ و حج و زکوٰۃ
ان پہ واجب شہر میں امن و اماں کا انتظام

تاکہ ہم مشغولِ تسبیح و عبادت رہ سکیں
حق نے دے رکھا ہے اُنکو ملک کا ضبط و نظام

اصطلاحِ عام میں محصول کہدیں یا خراج
درحقیقت ہے یہ مزدوری کا اک اچھا سا نام

کہدو اے مومن مسلمانو! تمہیں انصاف سے
کیا ملازم وہ ہمارے ہیں کہ ہم اُن کے غلام؟

اسد ملتانی

جینک روڈ پٹنہ
۲۶ ر ستمبر ۸۱

مکرم و مخلص السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

معارف القرآن جا مضمون جا کاغذ جا چھاپہ جسکی جلد اور جسکے سارے تکلفات بہ اقتضائے کلام الہی
دلچسپ ہیں اللہ اوسپہ خلوص نیت کا رنگ الگ چڑھا ہوا ہے یا یہ دیکھیں مجھے آپنے یاد فرمایا
رہنے ہی اخلاص کے معنی کا ثبوت لیا میں تو خدا کا شکر ادا کر سکتا ہوں نہ اونکے مخلص محسنین کا
شکریہ ادا کر سکتا ہوں اور مجھے اپنے اس عجز کا اعتراف ہے میں نے خوردبینی سے اسکو دیکھنا شروع کیا
ڈاکٹر اسلم صاحب جسٹس چہودی کا خط قابل قدر مقدمہ دیکھ کر آگے ابھی دیکھا - پھر مقدمہ سارے کا سارا
پیج کے اندر مخصوصیات سے پاک مورخانہ اور صداقت سے بھرا ہوا پایا - کہ آگے کتاب کا حصہ دیکھ
ان تک دیکھا اوسکے تو معلوم ہوتا ہے کہ حسب طبع عکس متن قرآن چھپنا شروع کیا ہے آپنے میری
بدعت اور ضلالت کا عکس ہر جگہ شائع فرمایا ہے اسقدر ایجاد خیالات ہی کا حیرت انگیز
پیچھے رب اوسکی تعریف کرتا تو اسی تعریف کرتا ہے اور ۹۱ تک الفتیم کے احاطہ کے اندر
ہے سے سپردگی اصل کتاب تو ابھی دیکھنی باقی ہی ممکن ہے کہ بہ اقتضائے فطرت کہیں کہیں چیزوں
خلاف ہو تو وہ کوئی چیز نہیں ہے جب لوگوں نے قرآن میں اختلافات پیدا کئے تو اور نقصانوں
پہنچایا امر آئندہ رب کی سیرت ہے ایسے کفش آدرنہ صحف کا کتاب کی
ہمت بیدار کھی ہے اور مجھے منتہت کی اطلاع فرما کر مطلع کئے تو بہتر ہے

مسعود باقی

(مضمون مکتوب گرامی شمس العلماء علامہ حافظ سید محب الحق صاحب مدظلہ)

بلینک روڈ پٹنہ
۲۶ ستمبر ۱۹۴۱ء

مکرم و مخلص سلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معارف القرآن جس کا مضمون، جس کا کاغذ، جس کا چھاپہ، جس کی جلد اور جس کے سارے تکلفات بہ اقتضائے کلام الٰہی لاجواب ہیں اور اس پر خلوص نیت کا رنگ الگ چھایا ہوا ہے باہمہ دلکشی مجھے آپ نے عنایت فرمایا اور میں نے بھی اخلاص کے ہاتھوں ہی لیا۔ میں نہ تو خدا کا شکر ادا کر سکتا ہوں نہ اُس کے مخلصین و محسنین کا شکریہ ادا کر سکتا ہوں، اور مجھے اپنے اس عجز کا اعتراف ہے۔ میں نے فوراً ہی اس کو دیکھنا شروع کیا۔ مخلصی مولوی اسلم صاحب جیراجپوری کا قابلِ قدر مقدمہ دیکھ کر کچھ آگے بھی دیکھا۔ یہ مقدمہ سارے کا سارا موضوع کے اندر فضولیات سے پاک، مورخانہ اور صداقت سے بھرا ہوا پایا، کچھ آگے کتاب کا حصہ بھی دیکھا جہاں تک دیکھا اُس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح عکسی قرآن چھپنا شروع ہوا ہے آپ نے میری عقیدت اور خیالات کا عکسی مرقع شائع فرمایا ہے۔ اس قدر اتحادِ خیالات بھی کیا حیرت انگیز نہیں ہے۔ اب ان کی تعریف کرنا اپنی تعریف کرنا ہے۔ اور لا تزکوا انفسکم کے احاطہ کے اندر ممنوع ہے۔

بہرکیف اصل کتاب تو ابھی دیکھنی باقی ہے ممکن ہے کہ بہ اقتضائے فطرت کہیں کہیں جزوی اختلاف ہو تو وہ کوئی چیز نہیں ہے۔ جب لوگوں نے قرآن میں اختلافات پیدا کئے تو اور تصنیفوں کا کیا ٹھکانا۔ باقی آئندہ آپ کیسے ہیں؟ ہم سے بعض آدمیوں نے سوال کیا کہ کتاب کی قیمت کیا رکھی ہے اور مجھے قیمت کی اطلاع نہیں مطلع فرمائیے تو بہتر ہو۔

(سید محب الحق)

وہی ہُوا

جس کا ڈر تھا۔ ہمیں پہلے ہی خدشہ تھا کہ جنگ کے اس زمانہ میں جب ہر شے روز بروز گراں ہوتی چلی جارہی ہے یہ مشکل ہوگا کہ "معارف القرآن" کی ایسی عمدہ جلد پھر بھی اُسی نرخ پر تیّار ہو جائے جس نرخ پر پہلی قسط تیّار ہوگئی ہے۔ چنانچہ یہی ہوا، اور اب جلد ساز نے اس نرخ پر جلدیں تیّار کرنے سے انکار کر دیا۔ اسلئے مجبوراً جلد کی قیمت میں اضافہ کرنا پڑا۔

اب ۱۰ر نومبر کے بعد مجلّد کتاب کی قیمت بجائے چھ روپے چار آنے کے چھ روپیہ آٹھ آنہ ہوگی۔ محصول ڈاک ایک روپیہ۔

غیر مجلّد کی قیمت وہی پانچ روپے۔ محصول ڈاک تیرہ آنہ ہے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام دہلی

نوجوانوں سے چند باتیں

(جناب ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحبؒ۔ جامعہ عثمانیہ۔ حیدر آباد)

[اگر ان اسباب و علل کا تجزیہ کیا جائے جن کی وجہ سے ہماری قوم آج موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ اس کا جزو اعظم ہماری شعر و شاعری ہے۔ یہ وہ تپ دق ہے جس میں آج قوم کا قریب قریب ہر نوجوان مبتلا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم کا یہی عنصر جسے ایک زندہ قوت ہونا چاہئے تھا راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گیا۔ ہماری قوم کا نوجوان اپنے تصورات کی حسین دنیا میں سرمست، حقائق سے بے نیاز، جھوٹی تعریف اور نمائشی تحسین کے کھلونوں سے کھیلتا رہتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ قومیں کیا کر رہی ہیں اور ان کا رخ کس طرف کو ہے؟ یہ موضوع نہایت اہم ہے اور ہم ایک مدت سے ارادہ کر رہے تھے کہ نوجوانوں کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جائے۔ لیکن دیگر اہم مسائل نے اس کی فرصت نہ دی (اگرچہ اس کے متعلق ضمناً دو ایک مرتبہ کچھ لکھا بھی گیا[1] لیکن وہ ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کافی نہ تھا) ہم اپنے محترم ڈاکٹر صدیقی صاحب کے شکر گذار ہیں کہ انھوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا یہ ابتداء اس لئے بھی مبارک ہے کہ اگر ہم اپنی طرف سے کچھ کہتے تو قوم کے نوجوان یہ کہکر اپنے آپ کو فریب دے لیتے کہ یہ "دقیانوسی قسم کے لوگ" "جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے امیال و عواطف اور فنونِ لطیفہ کی نزاکت و نفاست کو کیا جانیں! لیکن اب تو انھیں یہ کہکر خود فریبی کا موقعہ نہ رہے گا اس لئے کہ صاحب مضمون نہ صرف جدید تعلیم یافتہ بلکہ اس تعلیم میں اس مقام پر پہونچے ہوئے ہیں جس کے اعتراف میں استادانِ مغرب نے انھیں "نوبل پرائز" کا مستحق سمجھا ہے۔

ہم جناب ڈاکٹر صاحب کے اس لئے بھی شکر گذار ہیں کہ انھوں نے باوجود علالتِ طبع **طلوع اسلام** کو اپنی یاد سے نہیں بھلایا اور اپنے گرامی نامہ میں ایک اور مضمون کا وعدہ بھی فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی صحت اور عزم میں برکات عطا فرمائے۔ طلوع اسلام]

---

[1] ملاحظہ ہو "زبان کا مسئلہ" جو الگ پمفلٹ کی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

چند دن قبل مجھے ایک ادبی ادارہ کی طرف سے منعقدہ مشاعرہ میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ یوں تو اس مشاعرہ میں ملک کے چند مشہور اور کہنہ مشق شاعر بھی موجود تھے اور ایک دو ہستیاں ایسی بھی تھیں جن کا باہر والے بھی احترام کرتے ہیں لیکن زیادہ تر تعداد نوجوانوں کی تھی جن میں سے اکثر نے شاید ابھی مدرسہ یا کالج کی تعلیم بھی ختم نہیں کی یا کم از کم جن کو ابھی زیر تعلیم ہونا چاہیئے۔ ان حضرات نے اپنی حیثیت اس قسم کی بنا رکھی ہے جس کو وہ شاید ایک شاعر کے لئے لازمی سمجھتے ہیں انھیں دیکھکر پیرس کے وہ "حسن کار" یاد آجاتے ہیں جو دو برس قبل تک وہاں کے اکثر کافی خانوں میں نظر آتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے نوجوانوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ طرز غالباً وہیں سے اڑائی ہے فلم کے ذریعہ سے ان "تہذیب یافتہ" قوموں کی زندگی اور ان کے رہنے سہنے کا طریقہ ساری دنیا کو معلوم ہو چکا ہے، ہمارے نوجوان بھائیوں نے بھی پیرس کے اس منظر کو پردۂ سیمیں پر اکثر دیکھا ہوگا یہ حسن کار چاہے پیرس کے ہوں یا حیدرآباد کے، ہمیں سر دست ان کے لباس یا وضع قطع سے کوئی بحث نہیں، ہم یہاں اس مسئلہ پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ نوجوانوں کی اکثریت کا فنون لطیفہ میں اس قدر انہماک ہماری قوم کے ارتقا پر کیا اثر ڈالے گا۔

پیرس کے حسن کاروں کا ذکر آیا ہے تو ان کے متعلق کچھ تفصیل بھی نامناسب نہ ہوگی۔ ایک تو ان ماہرین کا گروہ ہے جن کو حسن کاری اور فن لطیف کا ذوق فطرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے اور جنھوں نے طویل محنت اور مشق کے بعد جگر کو خون کر کے اپنے فن میں مہارت اور شہرت حاصل کی ہے ظاہر ہے کہ اس گروہ کے خوش قسمت افراد کی تعداد بہت ہی قلیل ہے۔ دوسرے گروہ میں پیرس کے مدرسوں، یونیورسٹی اور دوسرے اداروں کے طالب علم اور ان کے علاوہ وہ نوجوان شامل ہیں جن کو ان کے والدین تعلیم کی غرض سے پیرس بھیجتے ہیں۔ ان نوجوانوں کا اصول حیات ہے

"خوش باش دمے کز زندگانی ایں است"

اس خوش باش کے لئے پیرس میں ایک عرصے سے بنا بنایا میدان موجود ہے جس کو بوہیمین سوسائٹی (Bohemian Society) کہتے ہیں اور جو حسن کاری کے انہی نام نہاد امیدواروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ "یہ حسن کار" مختلف فنون لطیفہ کے متعلق چند سطحی معلومات حاصل کر لیتے ہیں اور ان کی بنا پر خود اپنے متعلق تعلّی اور ایک دوسرے کے کام کی مدح سرائی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں ان کا دن سونے میں اور رات کافی خانوں اور یا اپنے کمروں میں ادھم مچائے رکھنے میں بسر ہوتی ہے ان کے بھاری بھرکم الفاظ اور لایعنی اور مہمل گفتگو سے قطع نظر کی جائے تو دنیا کے حالات سے ان کی واقفیت اتنی بھی نہیں ہوتی جو ایک معمولی پڑھے لکھے مزدور کی ہوتی ہے۔ فرانس کی نئی نسل جب اس طرح تباہ ہوئی تو اس کا نتیجہ دنیا نے جون ۱۹۴۰ء میں دیکھا کہ دس دن کے اندر جرمنی نے اتنی بڑی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ فرانس اور بیرون

کے اکثر مدبّروں نے اس مکمل شکست کے اسباب میں بڑا سبب نوجوان نسل کے اس داغی اور جسمانی تعیش کو بتایا ہے۔ راقم الحروف کو موجودہ جنگ شروع ہونے سے تقریباً دو برس قبل بھی اس حالت کو مشاہدہ کرنے کا موقع ملا تھا اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ خود ہمارے نوجوانوں میں بھی اس پیرس کی حالت سے کسی قدر توازیت (Paralelliam) پائی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس خطرہ سے بروقت آگاہ کر دینا بہت ضروری ہے۔

اس میں شک نہیں کہ شاعری، موسیقی، مصوری وغیرہ فنون لطیفہ کسی قوم کی تہذیب اور ترقی کے آئینہ دار ہوتے ہیں لیکن یہ بھی بالکل صحیح ہے کہ جب یہی چیزیں حد سے زیادہ گذر کر نوجوانوں کی طبیعتوں میں عام طور پر سرایت کر جاتی ہیں تو وہ قوم کے انحطاط کی نشان زدگی کرنے لگتی ہیں۔ مصر، بابل، یونان، روما، ایران اور چین کے زوال کے حالات کا مطالعہ کیجیے، آپ کو ان سب میں یہی ایک مشترک جزو نظر آئے گا؟

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر (اقبالؒ)

نوجوانوں میں شاعری اور ادب نوازی کی طرف عام رجحان اور انہماک کے محرکات پر غور فرمایئے، شہرت اور عزت کی خواہش ہر انسان کے دل میں کم و بیش ہوتی ہے اور ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اپنے ہم چشموں میں ممتاز حیثیت حاصل کرے، اب شہرت و امتیاز حاصل کرنے کے چند محدود طریقے ہی ہیں، حکومت۔ دولت کسی علم یا فن میں مہارت گیمس اور اسپورٹس میں غیر معمولی کمال، ان کے علاوہ ممکن ہے دو ایک طریقے اور ہوں۔ ہماری سوسائٹی کے موجودہ نظام میں حکومت اور دولت یا تو آبا و اجداد سے ورثہ میں ملتی ہیں یا کبھی اکا دکا افراد کو بالکل اتفاقی طور پر حاصل ہو جاتی ہیں۔

بہرحال دولت یا حکومت کسی قوم میں صرف معدودے چند افراد کے حصہ میں آتی ہے شہریوں کی ایک عظیم اکثریت تو اس سے کم و بیش محروم ہی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ دولت اور حکومت سے ایک قسم کا امتیاز تو حاصل ہو جاتا ہے لیکن حقیقی عزت اور ہر دلعزیزی نصیب ہونا ضروری نہیں ہے۔ یہ نعمت صرف علم، فن خطابت وغیرہ کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی ایک چیز میں کمال حاصل کرنے کے لئے سالہا سال تک صبر و استقلال کے ساتھ محنت شاقہ برداشت کرنی پڑتی ہے!

"جگر خون ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا" (اقبالؒ)

لیکن قوم میں سے جب اپج اور ہمت کا مادہ کم ہونے لگتا ہے تو اس کے افراد اور خصوصاً نوجوانوں میں مشکل پسندی کی بجائے آرام طلبی پیدا ہو جاتی ہے۔ پہلے تو ان کا نصب العین ہی پست ہو جاتا ہے اور پھر اپنی خواہشات کی تکمیل

کے لئے وہ راستہ بھی وہی اختیار کرتے ہیں جس میں مزاحمت کم سے کم ہو چنانچہ وقتی شہرت اور زود فنا ہر دلعزیزی حاصل کرنے کا بھی ایک آسان اور سستا طریقہ ہے اپنی زبان کے چند الفاظ کو الٹ پھیر کر مرعوب کن یا خوش آئند جملے بناتے چلے جائیے اور پھر جی چاہے تو "نثر میں شاعری کیجیے یا" نظم میں ساحری" نہ صرف ایک خاص طبقہ میں بلکہ ان عوام میں بھی جنھیں وقت کو خوشگوار طریقہ پر کاٹنے کی تلاش رہتی ہے آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائے جائیں گے، کوئی اس پر غور نہیں کرتا کہ شاعر یا ادیب کوئی مکڑی تو ہے نہیں کہ اپنے ہی پیٹ میں سے جالا بنتا چلا جائے۔ شاعری اور ادب کی بنیاد تو انسان کے ذاتی تجربہ اور احساسات پر ہوتی ہے یا دنیا اور زندگی کے حقائق کے متعلق غور و فکر پر۔ یا پھر دوسرے مفکرین کے کلام کے وسیع مطالعہ اور تجربہ پر۔ اس میں شک نہیں کہ شعر و ادب میں ایک بڑا عنصر غیبی الہام و القا کا ہوتا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ الہام و القا بھی صرف انھی لوگوں پر ہوتا ہے جنھوں نے ایک عمر کی ریاضت اور مشقت سے اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کیا ہو ہم جب ابھی مدرسہ یا کالج کی ابتدائی منزلوں میں ہوں تو سمجھنے کی بات ہے ہمارا تبصرہ، دنیا کے حقائق سے واقفیت، اوروں کے افکار کا مطالعہ، یہ سب کس قدر ناقص ہیں۔ ہمارا مبلغ علم ہی کیا جو ہمیں بلند مضامین یا بلند خیالات سوجھیں یہ نمائش ہیں جو بھری محفلوں میں ہماری طفلانہ نظموں اور غزلوں پر واہ واہ کے نعرے بلند کرتے ہیں ان سے ہمیں دھوکہ نہ کھانا چاہیئے یہ صرف اپنی خوش وقتی چاہتے ہیں۔ بظاہر تو یہ تعریف کرتے ہیں لیکن اصل میں یہ ہمیں بے وقوف بناتے ہیں اور اپنے بے تکلف احباب کی صحبت میں ہماری سادہ لوحی کا مذاق اڑاتے ہیں۔ کیا ہم واقعی اس کا یقین کر سکتے ہیں کہ جن لوگوں کے لئے فردوسی، سعدی، شیکسپیر، گوئٹے، غالب، اقبال، غرض دنیا کے بلند ترین شعر و ادب کو پڑھ کر لطف اٹھانے کا موقع ہمیشہ موجود ہے وہ ہمارے طفلانہ خیالات سے محظوظ ہوتے ہونگے۔ اپنے سنجیدہ لمحوں میں تو وہ انہی کلاسکس (Classics) کی طرف رجوع کرتے ہیں لیکن جب دل بہلانا یا وقت کاٹنا مقصود ہو تو پھر انھیں آپ کا ہمارا مذاق اڑانے کی سوجھتی ہے کیونکہ ہماری شاعری میں اکثر ہوتا ہی کیا ہے؟

اس عہد میں شاعر کے لئے قوت نہیں ہے
اس باغ میں طوطی کے لئے قوت نہیں ہے
لفظوں ہی کے چکر میں ہیں سب افعل و تفعل
چرخا ہی چلا کرتا ہے اور سوت نہیں ہے (اکبر)

اس کے علاوہ آپ جانتے ہیں اس دنیا میں سائنس اور میکانیت کا دور دورہ ہے آج کل نہ صرف افراد کا بلکہ

قوموں کا بھی جینا مرنا مشینوں کی طاقت پر منحصر ہے۔ یہ بحث اب بے سود ہے کہ ایسا ہونا چاہیئے یا نہیں یعنی انسانوں کو مشینوں کا غلام بننا چاہیئے یا نہیں۔ سوال اب اخلاقی یا مذہبی اصول کا نہیں۔ جب مشینوں کا وجود ایک امر واقعہ ہو تو ہمیں اس واقعہ سے نبٹنا چاہیئے اور اس لئے جہاں تک ہو سکے ہمارے افراد کی زیادہ تعداد کو مشینوں کا چلانا۔ انھیں درست کرنا اور موقع ملے تو انھیں بنانا بھی سیکھنا چاہیئے، اس سے ایک قدم آگے بڑھکر یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ اگر مشین بنانے کے مواقع موجود نہیں ہیں تو پیدا کئے جائیں، خانگی پیمانوں اور خود حکومت سے اس کی درخواست کرنی چاہیئے کہ ایسے ذریعہ فراہم کئے جائیں جس سے ملکی اور قومی ضرورت کی تمام اشیا اور خصوصاً مشینیں یہیں تیار کی جائیں اور افراد قوم کو ان کے استعمال کا عادی بنایا جائے۔ یہ زمانہ نہیں کہ ہمارے نوجوان شعر و شاعری میں والہانہ منہمک رہیں۔ مشین کا جواب اشعار سے نہیں دیا جا سکتا، چاہے ان اشعار میں گل و بلبل کی داستان دہرائی گئی ہو یا کسان اور مزدور کی مظلومیت یقین مانئے کہ اوّل الذکر کی طرح آخر الذکر شاعری بھی اب فرسودہ اور پامال ہوتی چلی جا رہی ہے کیونکہ زمانہ کا رجحان دیکھکر ہمارے نوجوان شاعر بلا امتیاز اس میدان میں طبع آزمائی کرنے لگے ہیں، غرض ہماری استدعا ان نوجوان بھائیوں سے یہی ہے ؎

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ

بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ (اقبالؒ)

اس سے ہمارا مطلب یہ نہیں کہ تمام شاعرانہ اور ادیبانہ کوششیں یک لخت موقوف کر دی جائیں۔ بلکہ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس بارے میں احساس تناسب سے کام لینا چاہیئے، جذبات کی فراوانی کے تحت اگر ہم کبھی کبھی اپنے خیالات اور احساسات کے اظہار کی کوشش بھی کریں تو انھیں ابتدائی مشقوں سے زیادہ اہمیت اور وقعت نہیں دینی چاہیئے۔ اپنا دل بہلانے کے لئے تنہائی میں پڑھنا یا دو چار بے تکلف دوست احباب کو اصلاح کی غرض سے سنانا جائز ہے لیکن اپنی ابتدائی مشقوں کو بھرے مشاعرہ میں پڑھنا یا اخباروں اور رسالوں میں شائع کرنا سوائے اپنی تضحیک کے اور کچھ نہیں۔ اچھا شاعر بننا اچھے سائنس داں بننے سے کہیں زیادہ مشکل ہے کیونکہ سائنس میں پھر بھی قاعدہ اور قانون پایا جاتا ہے۔ لیکن شاعری صرف خدا کی دین ہے جب تک ہمارے "نالے ابھی خام ہوں" انھیں اپنے "سینے میں تھامنا" لازمی اور ضروری ہے، پختگی، خلوت کی تنہائی میں ہی حاصل ہوتی ہے، شاعری صرف الفاظ کی بندش اور قافیہ اور ردیف کی پابندی ہی نہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت نگاری ہے جو اپنی مخصوص زبان میں بیان کی جاتی ہے جس طرح کہ سائنس اور حکمت میں حقیقت اصطلاحی زبان میں بیان کی جاتی ہے۔ ایک ایک شعر میں کائنات کے متعلق وہ حقیقت بیان ہوتی ہے

جس کے لئے سائنس میں صفحوں کے صفحے درکار ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ شاعری کے لئے کس قدر غیر معمولی صلاحیت اور قابلیت کی ضرورت ہے۔ اور یہ ہماری خود فریبی ہے اگر ہم سمجھیں کہ ابھی طفل مکتب رہ کر ہم شاعری اختیار کر سکتے ہیں

اگر ایں کار را کار نفس دانی چہ نادانی

دم شمشیر اندر سینہ باید نے نوازی را (اقبالؔ)

ہمارے نوجوانوں کے اس شاعرانہ اور ادیبانہ ابال کی ذمہ داری بڑی حد تک سوسائٹی اور حکومت پر بھی عائد ہوتی ہے۔ خانگی اور سوسائٹی کی محفلوں میں آؤ بھگت ان ہی لوگوں کی کیجاتی ہے جو اپنی شاعری یا لفاظی سے محفل کو گرما سکیں، انجمنوں کے پلیٹ فارم پر بے تحاشا بولنے والوں کو پیش پیش رکھا جاتا ہے چاہے چرب زبانی کے اس مظاہرہ میں کوئی کام کی بات ہو یا نہ ہو، اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹر صاحبان نوجوانوں سے نظمیں اور مضمون لکھواتے اور ان کی بری بھلی تحریریں شائع کرتے رہتے ہیں۔ اس سے ایک تو اخباروں اور رسالوں کے صفحوں کی تعداد پوری ہوتی ہے اور دوسرے ان پرچوں کی نکاسی بھی ہوتی ہے کیونکہ مضمون لکھنے والے اپنے اور اپنے احباب کے لئے کاپیاں ضرور خریدتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آئے دن اخباروں میں بیسیوں انجمنوں کی روئدادیں اور ہر سیاسی، سماجی، معاشی، علمی مسئلہ پر مختلف حضرات کے بیانات شائع ہوتے رہتے ہیں اور ان حضرات میں سے بھی اکثر ہمارے نوجوان طالب علم ہوتے ہیں آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں محض قیاسی باتیں لکھ رہا ہوں، ایک مقامی روزنامہ کے تجربہ کار ایڈیٹر صاحب سے گفتگو کے دوران میں اس راز کا انکشاف ہوا ہے، غرض کہ انجمنوں کے معتمدوں، مشاعروں اور کانفرنسوں کے منتظموں، اخباروں کے ایڈیٹروں اور رسالوں کے مدیر صاحبان کے تقاضوں اور ترغیبوں کی اس فراوانی میں کون نوجوان ہے جو اپنا دامن بچائے جائے جس کسی کے دل میں ذرا بھی شہرت اور امتیاز کی خواہش ہو (اور کتنے ایسے نوجوان ہیں جن کے دل میں یہ خواہش نہیں) وہ اس جال میں پھنس جاتا ہے، پھر دوست احباب کی ہمت افزائی بزرگوں کی شاباش اور حاضرین محفل کی واہ واہ (چاہے طنز آمیز ہی کیوں نہ ہو) اس شعلہ اشتیاق کو بھڑکاتی ہے۔ اس کے بعد کیا تعجب ہے اگر ہمارے نوجوان محنت و مشقت کی زندگی سے جی چرانے لگیں اور نمود و نمائش کے مشاغل کو ترجیح دیں۔

مشتے نمونہ از خروارے، یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے چند دن قبل ایک مقامی اخبار کے ایڈیٹر صاحب نے "انسداد گداگری" پر دو تین کالموں کا اداریہ تحریر فرمایا، اس کے دوسرے دن اس اخبار میں اسی عنوان پر تقریباً اسی قدر طویل، مضمون ایک ایسے بزرگ کا شائع ہوا جنھیں کافی عمر کے باوجود علمی اور صحافتی میدان کا کچھ زیادہ تجربہ نہیں تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب انھوں نے اس کمی کو پورا کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ ان بزرگ کے مضمون کا متن

چوتھائی حصہ ایک دن قبل چھپے ہوئے اداریہ کے مختلف ٹکڑوں کو داوین کے اندر لفظاً بہ لفظاً نقل کر دینے پر مشتمل تھا اور بقیہ چند سطریں اس طرح کے جملوں پر مشتمل تھیں "جیسا کہ مدیر اخبار نے لکھا ہے" یا "مدیر اخبار بجا فرماتے ہیں" وغیرہ مضمون نگار صاحب کا مقصد اچھی طرح پورا ہو جاتا اگر وہ صرف یہ ایک جملہ لکھ دیتے کہ "ہمیں مدیر اخبار کی رائے سے لفظ بہ لفظ اتفاق ہے" کیونکہ بالآخران کی ساری خامہ فرسائی کا حاصل یہی تھا۔ لیکن اس طرح لیڈری کی خواہش کیسے پوری ہوتی اور مضمون کے اخبار میں چھپنے کا ارمان کیسے نکلتا؟ دوسری طرف ایڈیٹر صاحب کو اخبار کے مقررہ صفحوں کی تعداد پر کرنے کے لئے مواد کہاں سے ملتا اور خریداروں کی تعداد میں اضافہ کیسے ہوتا؟

اس کے علاوہ ان مضمونوں میں صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جائیے کام کی بات شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ مضمون نگار ہر وادی میں بھٹکتے ہیں لیکن حاصل کچھ نہیں کرتے ؎

دشت و کہسار نوردید و غزالے نگرفت

طوف گلشن زد و یک گل بہ گریبانش نیست (اقبالؔ)

خود حکومت نے اپنی اعلیٰ قسم کی ملازمتوں کے لئے امیدواروں کے انتخاب کے جو طریقے مقرر کئے ہیں ان سے نوجوانوں کے اس عام رجحان کو اور تقویت ہوتی ہے سیول سروس وغیرہ کے مقابلہ کے امتحانوں میں کامیابی کا دار و مدار انگریزی تقریر و تحریر کو کیا گیا ہے ہماری سمجھ میں اب تک نہیں آیا کہ آخر اچھی تقریر کرنے یا اچھے مضمون لکھنے اور حکومت کے مسئلوں کو سلجھانے یا نظم اور ضبط کو قائم رکھنے میں کونسا منطقی تعلق ہے، اگر حکومت کو محکمہ کروڑگیری یا مال یا پولیس کے لئے کسی عہدہ دار کی تلاش ہے تو کیا ضرورت ہے کہ ادب، تاریخ، یا معاشیات کے طلباء ہی سے ہی انتخاب کیا جائے (موجودہ طریقہ انتخاب میں زیادہ کامیابی اسی زمرے کے طلباء کو ہوسکتی ہے) کیا ایک میکانک یا اوورسیر یا علمی سائنس کا طالب علم اس عہدہ کے فرائض کو انجام نہیں دے سکتا؟ جب تک حکومت اپنی پالیسی نہیں بدلے گی نوجوان لامحالہ انھیں مضمونوں کی طرف مائل ہونگے جو انھیں شاعری، لفاظی اور آخرکار ـــــ "لیڈری" سکھاتے ہیں۔ اس ملک میں مشاعرے اور کانفرنسیں تو ہر روز منعقد ہوسکیں گی لیکن وقت ضرورت ایک سوئی بھی کوئی نہیں بنا سکے گا اور آخر یہی نوبت آئے گی، کہ نہ صرف زندگی میں بلکہ مرنے کے بعد بھی ہم کفن اور دفن کے سامان کے لئے غیروں کے دست نگر رہیں گے۔ افراد اور اقوام کی زندگی کا یہ ناقابل انکار اصول ہے کہ پہلے ضروریات زندگی کی تکمیل کیجائے، اور پھر عیش و عشرت کے سامان کی فراہمی کی طرف رجوع ہوں؟ اس وقت شعر و سخن ہمارے لئے ذہنی تعیش سے زیادہ نہیں سوائے ان صورتوں کے جن میں شاعری سے پیغمبری کا کام لیا جائے۔ ہماری قوم کی بقا، تحفظ اور ترقی کے لئے سائنس اور مشین ضروریات میں داخل ہیں۔ ہماری

انفرادی اور اجتماعی کوششیں زیادہ تر اسی طرف مرکوز رہنی چاہیں۔ رسالہ المعلم بابتہ اسفندار سنہ ۱۳۵۰ف کے مضمون "ہماری ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم" میں میں نے اس نکتہ کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا ہے۔

حقائق و عبر

راز کی بات

ملّتِ اسلامیہ کی فلاح و بہبود کا احساس رکھنے والے حضرات مارے مارے پھر رہے ہیں کہ کسی طرح اس سوختہ بخت قوم کے درد کا درماں مل جائے۔ لیکن کوئی تدبیر کارگر اور کوئی تجویز کامیاب نہیں ہوتی۔ کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں۔ تحقیقاتی کمیشن بٹھائے جاتے ہیں۔ ارباب بست و کشاد آئے دن سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں۔ لیکن قوم ہے کہ روز بروز نکبت و افلاس کے ہلاکت آفریں گڑھے کی طرف بڑھے چلی جا رہی ہے۔ عقل حیران ہے۔ تدبر سر بزانو ہے۔ فکر انگشت بدنداں ہے کہ۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا؟ کیوں کوئی تدبیر کارفرما نہیں ہوتی؟ کیوں کوئی علاج موثر ثابت نہیں ہوتا؟ لیکن مبارک ہو کہ بالآخر "قدرت" کو اس شوریدہ خاطر قوم کی اس کس مپرسی اور مظلومی پر رحم آ ہی گیا اور بریلی شریف کے ایک مولوی صاحب نے قوم کے اس افلاس و زبوں حالی کے اصل راز کو پا لیا۔ اور راز کو پا لینے کے بعد کسی بخل سے کام نہیں لیا بلکہ یہ راز کی بات بھری بزم میں کہہ دی کہ فائدہ اُٹھانے والے اس سے فائدہ اُٹھائیں اور یوں مارے مارے نہ پھریں۔ سُن لیجئے کہ وہ راز کیا ہے؟ مولوی صاحب نے فرمایا:۔

"سنّی بھائیو! لوگ کہتے ہیں مسلمان غریب ہیں مفلس ہیں اور نادار ہیں، دولت و ثروت اور حکومت سے محروم ہیں۔ اور پھر مسلمانوں کی دُنیوی ترقّی کے لئے دولت و ثروت اور حکومت کی واپسی کے لئے کانفرنسیں کی جاتی ہیں۔ انجمنیں بنائی جاتی ہیں۔ اور تدبیریں سوچی جاتی ہیں حالانکہ یہ سب بیکار اور فضول باتیں ہیں۔ لوگ چونکہ اصلی بات اور اُس کے حقیقی سبب سے ناواقف ہیں اس لئے یہ فضول کام کرتے اور اپنا سر کھپاتے ہیں — بھائیو! آج میں آپ کو اس کا اصلی راز بتاتا ہوں اتنی بات پر تو سب کا اتفاق بلکہ ایمان ہے کہ زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کے بعد ہم

مسلمانوں خصوصاً سُنّیوں کا یہ بھی عقیدہ اور ایمان ہے کہ اللہ پاک نے زمین و آسمان کے سارے خزانے اپنے حبیبِ پاک صاحبِ لولاک حضرت احمدِ مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو سپرد فرما دیے ہیں اور اب سب کچھ حضور اقدس ہی اپنے ہاتھ سے تقسیم فرماتے ہیں۔ دُنیا میں اس کسی کو جو کچھ مل رہا ہے وہ حضور ہی کی عطا سے مل رہا ہے تو بھائیو! دنیاوی دولت و حکومت بھی سے حضور بالقصد اپنے اُمّتیوں کو کم حصّہ دیتے ہیں تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ حضور اپنے اُمّتیوں کو زیادہ بخشتے ہیں —— بس یہ ہے راز مسلمانوں کی غریبی اور حکومت و سلطنت سے اُن کی محرومی کا۔"

لیجئے صاحب! بات صاف ہو گئی۔ معاملہ واضح ہو گیا۔ اب مسلمانوں کی خوشحالی اور کامرانی کے لیے جدّوجہد نہ صرف عبث و بے کار ہی ہے بلکہ (ان محقق صاحب کی تحقیق کے مطابق) جنابِ سرورِ کائنات کی منشا کے خلاف۔ لہٰذہ معصیتِ رسولؐ۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارے جمعیت العلماء کے مولوی صاحبان مسلمانوں کی مرکزیت۔ جدا گانہ تشخص، اور خالص اسلامی اجتماعی زندگی کے خلاف ہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان چیزوں سے اس قوم میں خوشحالی اور فارغ البالی۔ حکومت و ثروت آ جائے گی اور یہ چیز (اس تحقیق کی رو سے) معصیتِ رسولؐ ہے۔ اب یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے جو فرمایا تھا۔ کہ

سب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے

زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

تو اس کا کیا مفہوم تھا! کس قدر احسانِ عظیم ہے ملّتِ اسلامیہ پر ان مولوی صاحب کا جنھوں نے اتنی کاوش و جگر سوزی کے بعد اس نکتہ دقیقہ کو پالیا اور اس کے بعد مسلمانوں کو آگاہ کر دیا کہ ہوش میں آؤ! کدھر جا رہے ہو!! لیکن ایک بات ذرا تفصیل طلب رہ گئی۔ شاید مولوی صاحب اسے بھی واضح فرما دیں۔ یعنی نبی اکرمؐ اپنے امتیوں کو زیادہ کچھ اس لئے نہیں دیتے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ دیکھیے سب کچھ اپنوں کو ہی دیدیا۔ لیکن اللہ میاں کو (معاذ اللہ) اس بات کا خیال نہیں آیا اور اس نے سب کچھ اپنے حبیبؐ کے حوالے کر دیا! اللہ میاں کو بھی تو یہ خیال رکھنا چاہیے تھا کہ کہیں لوگ یہ نہ کہیں کہ سب کچھ اپنوں کو ہی دے دیا۔ خدا اور رسولؐ کے مسلک میں یہ کھلا ہوا اُصولی اختلاف ہم عامیوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتا!۔

مولوی صاحب نے مسلمانوں کے تنزل و افلاس کی جو وجہ بیان فرمائی ہے اس پر آپ ایمان لائیں یا نہ لائیں، لیکن اس حقیقت کے اعتراف میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہوگی کہ جس قوم میں ایسے ایسے "دیدہ ور" موجود ہوں اس کے تنزل و ادبار کی وجوہات معلوم کرنے کے لئے کسی تحقیقاتی کمیشن کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اللہ کا عذاب مختلف قوموں پر مختلف شکلوں میں رونما ہوتا رہتا ہے۔ ہم پر وہ عذاب ایسے ایسے مولوی صاحبان کے پیکر میں نازل ہو رہا ہے۔

شامتِ اعمالِ ما صورتِ مُلّا گرفت

یہ ہے برگِ حشیش کا وہ بادۂ ہلاکت آمیز جس کا نام "محبتِ رسولؐ کی مئے حیات" رکھا جاتا ہے!

۴۔ جیتی رہو!

آج کل اخبارات میں شادی بیاہ کے معاملات کے متعلق اشتہار بازی ایک عام روش ہو گئی ہے۔ ۱۸ راگست کے ہندوستان ٹائمز میں دو "وسیع القلب۔ مہذب اور جاذبِ نگاہ" دوشیزگان کی طرف سے ایک اشتہار شائع ہوا۔ ان میں سے ایک ہندو لڑکی ہے اور دوسری مسلمان۔ ہندو لڑکی نے لکھا تھا کہ وہ کسی مسلمان سے شادی کرنا چاہتی ہیں اور مسلمان لڑکی نے لکھا تھا کہ وہ کسی ہندو نوجوان سے وابستۂ دامن ہونے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ اشتہار نکلا اور اس کے بعد کوئی چیز منصۂ شہود پر نہ آئی۔ فتح گڑھ (یو۔پی) کے ایک مسلمان صاحب نے محسوس کیا کہ دنیا ایسی کور ذوق ہو چکی ہے کہ کسی نے ان "دیویوں" کے اس عزم و ہمت اور متحدہ قومیت کے لئے اس جاں فروشانہ اقدام کی داد ہی نہیں دی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے جوش کے تقاضے سے ہندوستان ٹائمز مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۴۱ء میں ایک طول طویل مکتوب شائع کر دیا ہے، جس میں ان مصلحاتِ قوم کی اس ہمت کی جی بھر کر داد دی ہے جس کے دوران میں وہ رقمطراز ہیں:-

"یہ دونوں جوان باغی (لڑکیاں)۔ باغی نہیں بلکہ مصلح۔ جنھوں نے یہ اشتہار دیا ہے! میں انھیں خوش بختی کی دعا دیتا ہوں۔ خدا کی برکات ان کے ساتھ ہوں۔ میرا سرِ نیاز ان کے حضور جھک رہا ہے۔ میں انھیں ہندوستان کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے مقدمۃ الجیش سمجھ کر ان کی بارگاہ میں ہدیۂ سلام پیش کرتا ہوں۔ خدا ان کے ہم وطنوں کو بھی اس قسم کی بصیرت عطا فرمائے کہ وہ بھی ان کے نقشِ قدم پر چلیں ...... مجھے یقین ہے کہ مادرِ ہند ان پر فخر کرے گی اور انھیں

شاباش دے گی کہ انھوں نے اپنے عقیدہ اور عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ وہ اس کی سچی بیٹیاں ہیں۔"

اب ان داد دینے والے مسلمان سے یہ بھی سن لیجیے کہ ان کے نزدیک ان لڑکیوں کے اس اقدام کو سراہنے کی وجوہات کیا ہیں؟ فرماتے ہیں:-

"اس کے لئے ہمارے پاس مہاتما گاندھی سب سے بڑی سند ہیں۔ انھوں نے ۱۳ اپریل ۱۹۴۰ء کے ہریجن میں لکھا تھا کہ میں یقیناً اس خیال کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا چاہتا ہوں کہ یہ لاکھوں ہندوستانی جو ابھی چند دنوں پیشتر ہندو تھے۔ جب مسلمان ہو گئے تو مذہب کی تبدیلی کے ساتھ ہی ان کی قومیت بھی بدل گئی!"

یہ دلیل ہے قومیت کے نقطۂ خیال سے۔ اب دوسری دلیل ملاحظہ فرمایئے۔ لکھتے ہیں:-

"وہ کون سی بات ہے جو اس قسم کی مخلوط شادیوں سے مانع ہو سکتی ہے؟ اس قسم کی شادیوں پر کیوں پابندیاں عائد کی جاتی ہیں اور انھیں آئے دن کے فسادات اور خونریزی کا سبب کیوں بنا دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ مذہب نے یہ حیثیت اختیار کر رکھی ہے کہ جس جس تک اس کا ہاتھ پہنچ سکتا ہے وہ اس کے اخلاق کا محافظ ہے اور پھر اخلاق کو خدا کے قوانین کے تابع نہیں رکھتا بلکہ اُسے عہدِ قدیم کی قبائلی رسومات اور توہم پرستانہ عقائد پر قائم کرتا ہے جنھیں کوئی سمجھدار آدمی برداشت نہیں کر سکتا۔" (یہ آخری الفاظ انھوں نے مسٹر ڈی۔ ایف۔ کراکا کی کتاب سے اقتباساً لکھے ہیں) "یہ عہدِ قدیم کے فرسودہ معتقدات ہیں جو ملک کی ترقی اور آزادی کی راہ میں حائل ہیں۔"

ہمیں نہ تو ان بلند حوصلہ، وسیع القلب، روشن خیال، بھارت ورش کی سپوت بیٹیوں سے کوئی علاقہ ہے نہ انکی ان داد دینے والے قومیت پرست مسلمان صاحب سے کچھ دلچسپی۔ دلچسپی صرف اتنی ہے کہ انھوں نے خود تسلیم کیا ہے کہ مذہب نے اخلاقیات کی بنا خدا کے قوانین کی بجائے انسانوں کے رسمی معتقدات کو قرار دے رکھا ہے یعنی اگر خدا کے قوانین کے مطابق اخلاقیات کی بنیادیں قائم کر دی جائیں تو یہ روش ان کے نزدیک بالکل درست اور عقل و بصیرت کے مطابق ہے۔ اب دیکھئے کہ مسئلہ زیرِ نظر کے متعلق خدا کا قانون کیا کہتا ہے۔ ان صاحب کے نام سے ظاہر ہے کہ یہ مسلمان ہیں۔ اور ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن کریم کو خدا کا قانون سمجھے۔ اس

خدا کے قانون میں مشرکین کے ساتھ مناکحت کے متعلق ارشاد ہے کہ

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ ۲/۲۲۱

"اور مشرک عورتوں سے نکاح مت کرو۔ جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مشرک عورت تمھیں (بظاہر) کتنی ہی پسند کیوں نہ آئے لیکن مومن عورت اس سے کہیں بہتر ہے۔ اسی طرح مشرک مرد جب تک ایمان نہ لے آئیں۔ مومن عورتیں ان کے نکاح میں نہ دی جائیں۔ یقیناً خدا کا مومن بندہ ایک مشرک مرد سے بہتر ہے۔ اگرچہ (بظاہر) مشرک مرد تمھیں کتنا ہی پسند کیوں نہ ہو۔ یہ (مشرکین) تمھیں آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ تمھیں جنت و مغفرت کی طرف بلا رہا ہے۔ اللہ لوگوں کی ہدایت کے لئے اپنی آیتیں واضح کر دیتا ہے تاکہ متنبہ ہوں اور نصیحت پکڑیں۔

فرمایئے اس کے بعد کیا ارشاد ہے ؟

ذرا غور کیجئے۔ ہمارے مولوی صاحبان کی یہ کیفیت ہے کہ مسجد میں کوئی نوجوان نماز پڑھنے کے لئے آجائے تو پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ تمھارے ٹخنے ڈھکے ہوئے ہیں۔ آستینیں کھلی ہیں۔ داڑھی منڈی ہوئی ہے۔ سر کے بال انگریزی ہیں۔ کوٹ کی لمبائی چھوٹی ہے۔ لیکن ان کے سامنے آئے دن قومیت پرست نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی طرف سے اس قسم کی چیزیں شائع ہوتی رہتی ہیں جو علانیہ مذہب کے خلاف بغاوت لئے ہوتی ہیں۔ لیکن یہ حضرات ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ یہ علماء حضرات خود قومیت پرست واقع ہوئے ہیں ان کی اپنی یہ حالت ہے کہ قرآن کریم بنص صریح مشرکین کو نجس قرار دیتا ہے۔ لیکن یہ آئے دن انہی مشرکوں کے ساتھ مل کر ان کے ہاں کا پکا ہوا کھانا مزے لے لے کر کھا جاتے ہیں۔ اس لئے جب نوجوان ایک قدم اور آگے بڑھکر اس قسم کی مخلوط شادیوں کی تحریک پیش کرتے ہیں تو یہ حضرات زبان نہیں ہلا سکتے اور اس لئے بھی کہ انھیں معلوم ہے کہ ان کے نشتر کی زد خود انھیں میں کے بعض قومیت پرست حضرات کی دکھتی ہوئی رگ تک پہنچ جائے گی۔ چنانچہ کفر و الحاد کے یہ اسلام سوز مظاہرے آئے دن ہوتے رہتے ہیں اور ان تحفظِ ناموسِ دین کے مدعیان کی زبان سے ایک حرف احتجاج و مخالفت کا نہیں نکلتا۔ وہ ہے قوم کا نوجوان طبقہ اور یہ ہیں ان کے مرشدانِ طریقت۔

ان کی سندھی گاندھی جی اور ان کے خضرِ راہ بھی رہی۔ اس نئے دین حقہ وہ جو اکبر نے جاری کیا اور جس کی تبلیغ آج متحدہ قومیت کے فریبِ نگاہ نقاب کی آڑ میں زندگی کے ہر شعبے میں جاری و ساری ہے۔

۳۔ تہذیب بربریت

برٹش ایسوسی ایشن کے صدر، سر رچرڈ گریگوری نے اپنی جمعیت کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"جس کرب و الم میں آج دنیا مبتلا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ علم کا استعمال ناجائز ہو رہا ہے اور جہاں تہذیب بربریت نے زندگی کے بلند مقاصد و مطامح کو ٹھکرا رکھا ہے۔" (ہندوستان ٹائمز ۹/ہم ۲۹)

جس چیز نے آج تک تہذیب مغرب کو محکوم قوموں کی نگاہ میں اس قدر درخشندہ و تابناک بنا رکھا ہے وہ ان کی علمی تحقیق (سائنس کے انکشافات) ہے۔ لیکن غور فرمائیے کہ علم و عقل کے ان مدعیان کا اپنی اس متاعِ عزیز کے بارے میں کیا فیصلہ ہے ـــ وہی فیصلہ جو آج سے چودہ سو برس پیشتر قرآن کریم کی بارگاہ سے صادر ہوا تھا دانایانِ فرنگ بالآخر اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ علم اچھی چیز ہے لیکن اس کا غلط استعمال تریاق کو زہر بنا دیتا ہے آب سوال یہ ہے کہ وہ کون سی کسوٹی ہے جس سے یہ پرکھا جا سکے کہ علم کا فلاں استعمال غلط اور فلاں صحیح ہے۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اگر انسان علم کو اپنی خواہشات کے ماتحت استعمال کرے تو یہ سرکش قوت پیکرِ فنا و ہلاکت بن جاتی ہے۔ لیکن اگر اُسے احکام خداوندی کے تابع رکھا جائے تو یہی علم دنیا میں جنت پیدا کر دیتا ہے مغرب نے علم الاشیاء کی تحصیل تو کر لی۔ لیکن

عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکا (اقبال)

جس کا نتیجہ یہ کہ آج کائناتِ انفس و آفاق کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو علم کے اس غلط استعمال کی وجہ سے جہنم نہ بن رہا ہو۔ دنیا کے نظام کو انسانی خواہشات کے تابع چلانا شرک ہے اور یہ شرک انسان کو ہلاکت کے جہنم کی طرف لے جاتا ہے

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ط فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ ۲۳/۴۵

کیا تم نے اُسے بھی دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو ہی اپنا خدا بنا لیا ہو۔ اور اُسے اللہ (کے قانون نے اس طرح) علم کے باوجود گمراہ کر دیا ہو۔ اور اس کے کانوں پر اور دل پر مُہر لگا دی ہو اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہو۔ ایسے شخص کو اللہ (کے اس فیصلے) کے بعد کون ہدایت دے سکتا ہے۔ کیا تم (اس کے بعد بھی) نصیحت نہیں حاصل کرتے؟

لیکن یہ عملی شرک کا نظامِ زندگی کب تک قائم رہ سکتا تھا۔ کوہِ آتش فشاں کے دامن میں کب تک امن و سکون کی رہا جا سکتا ہے۔ یہ آتش گیر مادہ پھوٹا اور زندگی کی ہر علامت کو راکھ کا ڈھیر بنا کر بڑھتا ہوا آگے چلا گیا اور چلا جا رہا ہے۔ دنیا کو اس آگ اور خون کے بحیرہ کے بعد ایک نئی زندگی ملنے والی ہے جس میں علم، قوانینِ الٰہیہ کے۔ یعنی عقل، عشق کے تابع رہے گی۔ اور اس وقت انسان اس منزل کی طرف جادہ پیما ہوگا جو اس کی زندگی کے ارتقائی مراحل کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ وَهُدُوْا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ

شیشہ باز

مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے اجلاس منعقدہ بمبئی میں، ڈیفنس کونسل سے استعفے دینے کے سوال پر مسٹر سکندر حیات خاں صاحب نے جو روش اختیار کی تھی اس کے متعلق ہم نے ستمبر ۱۹۴۱ء کی اشاعت میں تفصیلاً لکھا تھا۔ آپ ایک نظر سے اُسے پھر دیکھئے اس کے بعد غور کیجئے کہ کیا حقیقت وہی نہ تھی جس کا ہم نے ذکر کیا تھا۔ اس روش سے بعض حلقوں میں یہ شبہ ہونے لگ گیا تھا کہ خدا نکردہ۔ کہیں یہ سچ مچ کے مسلم لیگی، تو نہیں ہو گئے۔ انھوں نے اس شبہ کو بھانپا اور اپنی صفائی میں ایک ایسی نئی چال چلے جو کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہ تھی۔ یعنی انھوں نے مسٹر چرچل کے بیان کے جواب میں ایک ایسا بیان شائع کرایا جس سے اپنے پرائے سب محوِ حیرت ہو گئے۔ اپنے اس لئے کہ وہ مسلم لیگ کے اس بنیادی نصب العین کے سراسر خلاف تھا جس کے لئے اس ملی جماعت کا وجود قائم ہے۔ اور پرائے اس لئے کہ وہ اس کا خیال بھی نہ کر سکتے تھے کہ وہ "فرقہ پرستی" کا لیبل چھپانے کے لئے اس قسم کا متشدد قومیت پرست چولہ پہن لینگے۔ انھوں نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ مسٹر چرچل کا بیان یکسر ناتسلی بخش ہے۔ انھیں چاہیے کہ جنگ کے بعد

ہندوستان کی پوزیشن کے متعلق ایک واضح اور غیر مبہم بیان شائع کریں۔ یعنی

"جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ واضح الفاظ میں ہندوستان کی مستقبل کی حیثیت کو بیان کر دیا جائے اور اس بات کا وعدہ دیا جائے کہ ملک کے مختلف مفاد کے نمائندوں کی ایک منتخب جماعت متشکل کی جائے گی جس میں انگریزوں کے نمائندے بھی شامل ہوں جو ایک متفقہ دستورِ حکومت مرتب کریں۔ لیکن اگر وہ جماعت، ایک وقتِ معینہ کے اندر اس قسم کا متفقہ دستور مرتب نہ کر سکے تو پھر حکومتِ برطانیہ ان عناصر کے تعاون سے جو دفاعِ ملک کے مسئلہ میں (حکومت کے) مددگار رہیں، ایک مناسب دستورِ اساسی مرتب کر دے۔ جس کی رو سے ہندوستان کو درجۂ نوآبادیات (ڈومینین اسٹیٹس) عطا کر دیا جائے۔"

(ہندوستان ٹائمز ۱۰/۴۱ ۲)

انھوں نے اس دستورِ حکومت کی مزید تشریح ان الفاظ میں فرمائی

"وہ بنیاد یا ڈھانچہ جس کے مطابق اس دستورِ حکومت کو مرتب کیا جائے گا اس کمیٹی کے فیصلہ پر چھوڑ دیا جائے۔ یعنی یہ چیز کہ مثلاً آئینِ حکومت فیڈرل انداز کا ہو یا کنفیڈریسی انداز کا۔ یا کسی اور انداز کا جس سے اس ملک کے کوائف کے مطابق اور مقتضیات کو پورا کر سکے۔" (ہندوستان ٹائمز ۱۰/۴۱ ۷)

ان ہر دو بیانات کو غور سے پڑھئے اور دیکھئے کہ یہ تحریک کس طرح مسلم لیگ کے بنیادی مطالبہ کے خلاف ہے۔ مسلم لیگ نے ڈومینین اسٹیٹس کو ٹھکرایا۔ فیڈرل اندازِ حکومت کی یکسر مخالفت کی۔ اور اسی کی مخالفت کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں فیڈریشن آتے آتے رہ گئی۔ پھر مسلم لیگ نے حکومتِ برطانیہ کی اس تحریک کی مخالفت کی کہ تمام ہندوستان کی سیاسی جماعتیں مل کر ایک متفقہ نظامِ حکومت مرتب کریں۔ مسلم لیگ نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ مسلمانانِ ہند کو کوئی ایسا نظامِ حکومت قابلِ قبول نہ ہوگا جو ان کی اکثریت کے لئے پاکستان کا قیام اپنے اندر نہ لئے ہوگا۔ مسلم لیگ کا بس ایک ہی مطالبہ ہے اور ایک ہی نصب العین۔ سر سکندر حیات خاں صاحب نے مسلم لیگ کی اس تمام جد و جہد اور پیہم کد و کاوش کے علی الرغم یہ تحریک پیش کر دی اور صرف

پیش ہی نہیں کر دی بلکہ اس کے ساتھ یہ دھمکی بھی دی کہ

"اگر انگریزوں میں تدبر سیاسی کی کوئی سمجھ بوجھ باقی ہے تو انہیں چاہیے کہ میں نے جس قسم کی تجویز پیش کی ہے اس کے مطابق فوراً اعلان کریں۔ اگر دو یا تین ہفتے کے اندر ایسا نہ کیا گیا تو میں بلا تامل تمام سیاسی جماعتوں سے اپیل کروں گا کہ وہ ایک متحدہ محاذ قائم کر دیں" ہندوستان ٹائمز ۴؍ ۴۲ء)

اس گیدڑ بھبکی کے دو ہی چار روز بعد مسٹر ایمرے نے دارالعوام میں صاف صاف کہدیا کہ مسٹر چرچل کا بیان حکومت کے سابقہ اعلانات پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا۔ جس قسم کے اعلان کا مطالبہ سر سکندر حیات خاں صاحب نے کیا تھا۔ اس کا مسٹر ایمرے کی تقریر میں اشارہ تک بھی نہ تھا۔ اب چشم فلک اس تماشے کے لئے یکسر اضطراب تھی کہ دیکھیں اب کون سا "متحدہ محاذ" قائم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ مسٹر ایمرے کی طرف سے اس برتاؤ کے بعد اس کے سوائے اور چارہ کار ہی کیا رہ سکتا تھا۔ مسٹر ایمرے کو بیان دیئے ہوئے دو ہفتے گذر گئے لیکن سر سکندر ہیں کہ گونگے کا گڑ کھائے بیٹھے ہیں۔ بالآخر دو ہفتے کے سکوت کے بعد مُہرِ خاموشی ٹوٹی اور آپ نے فرمایا کہ "جس حد تک مسٹر ایمرے نے کہا ہے بالکل تسلی بخش ہے" (ہندوستان ٹائمز ۲۲؍ ۴۲ء) سبحان اللہ! اس دھمکی کے بعد کیسا عمدہ رویہ ہے جو اختیار کیا گیا۔ اس مقام پر ہمیں بے اختیار ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ایک پوربیہ سائیس مالک کی خوشامد کرتے کرتے تنگ آگیا تو اس نے سوچا کہ اب دھمکی سے کام نکالنا چاہئے۔ اس کے بغیر مالک تنخواہ میں اضافہ نہیں کرے گا۔ مالک دور سے آرہا تھا کہ اس نے چلانا شروع کر دیا کہ یہ بہت بڑا ظلم ہے۔ بڑی زیادتی ہے۔ ہم کام کرتے کرتے مر گئے ہیں اور ہماری تنخواہ میں آج تک اضافہ نہیں ہوا۔

اتنے میں مالک قریب آگیا اور اس نے کھونٹی کے ساتھ لٹکے ہوئے چابک کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ سائیس نے اپنے احتجاج کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اب آپ کو ہماری تنخواہ بڑھانی پڑے گی! اگر آپ نے تنخواہ نہ بڑھائی تو ......

اتنے میں مالک کا ہاتھ چابک تک جا پہنچا تھا۔ مالک نے کہا۔ ہاں! اگر تنخواہ نہ بڑھائی تو......
یہ کہہ کر مالک آگے بڑھا۔ تو نوکر بولا :- اگر تنخواہ نہ بڑھائی تو حضور! ہم پھر اسی تنخواہ پر کام کریگا!!

کس قدر افسوسناک تھی ہمارے اس فریب خوردہ بھائی کی روش اور کیسا عبرت انگیز تھا اس کا انجام۔ اور یہ سب اس لئے کہ کسی طرح ہندو خوش ہو جائیں کہ جناب سرسکندر حیات خاں صاحب فرقہ پرست نہیں ہیں بلکہ آزادیٔ ہند کے حصول کے لئے گاندھی جی سے بھی چار قدم آگے ہیں۔ لیکن جس مضحکہ انگیز اور نفرت آمیز طریقہ سے ہندوؤں نے اُن کی اس طفلانہ روش کا استقبال کیا۔ دیدۂ عبرت کے لئے سبق حاصل کرنے کے لئے وہ کافی سے زیادہ تھی۔ جو اپنی جماعت کو چھوڑ کر دوسروں کے ہاں عزت کا متلاشی ہوتا ہے اس کا یہی حشر ہوا کرتا ہے۔

لیکن ہمیں سرسکندر حیات خاں صاحب سے کہیں زیادہ افسوس خود مسلم لیگ پر آتا ہے کہ ان تمام باتوں کے باوجود سرسکندر لیگی وزیر بھی ہیں اور لیگ کی مجلسِ عاملہ کے رکن بھی! ہم آج تک نہیں سمجھ سکے کہ بالآخر لیگ کی اس روش کا مقصد کیا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ کوئی یہ کہہ دے کہ سرسکندر کی یہ باتیں تم لوگوں کو لیگ کے خلاف دکھائی دیتی ہیں لیکن ان میں کسی قسم کا تضاد و تباین نظر نہیں پاتی۔ اس لئے سرسکندر کے خلاف کسی اقدام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن خود لیگ کا سرسکندر کی اس روش کے متعلق کیا خیال ہے۔ یہ ہم سے نہیں۔ خود لیگ کی زبان سے سُنئے۔ منشور آل انڈیا مسلم لیگ کا سرکاری ترجمان ہے۔ اس کی ۱۹ اکتوبر کی اشاعت میں اس موضوع پر مقالۂ افتتاحیہ شائع ہوا ہے جس کے دوران میں تحریر ہے :۔

"لوگوں کو حیرت ہے کہ پنجاب کے وزیرِ اعظم کو خواہ مخواہ مسٹر چرچل کی اس تقریر پر جس میں انھوں نے اپنے نائب مسٹر ایمرے کی تردید کی تھی اتنی پریشانی کیوں ہوئی۔ اور پھر اتنی دیر بعد۔ پیشہ وزارت کا ہر جگہ ایک ہی چلن ہے۔ وہ انگلستان ہو یا ہندوستان۔ بس اتنا فرق ہے کہ آزاد ملک کا وزیر اپنی قوم کے مفاد میں دوسری اقوام کو جھکے دیتا ہے اور غلام ملک کا وزیر اپنے ذاتی مفاد میں اپنی ہی قوم کے مخلصین کو۔ سرسکندر غلام قوم کے نہایت ہی تجربہ کار وزیرِ اعظم ہیں وزارت کی راہوں سے جیسی اچھی واقفیت انھیں ہے کسی کو کم ہوگی۔ لہٰذا انھیں مسٹر چرچل کی تقریر کے متعلق نہ کوئی غلط فہمی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اس سے پہلے کہ مسٹر چرچل کی تقریر بھول میں پڑے اور اس کا اثر بالکل زائل ہو انھوں نے اس سے تھوڑا فائدہ اٹھا لیا۔ ڈیفنس کونسل کی رکنیت دور

اس کے مستعفی ہونے کے سلسلے میں لوگوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی کہ وزیر اعظم پنجاب اس قسم کے آدمی ہیں جسے ہندوؤں کی سیاسی اصطلاح میں فرقہ پرست کہتے ہیں۔ لوگوں کا ایسا گمان عہدۂ وزارتِ عظمیٰ کے لئے نہایت درجہ مضر ہے۔ لہٰذا وہ مسٹر چرچل پر چھا پڑے کہ انھوں نے ایسی تقریر کرکے ہندوستانیوں کو کیسے مایوس کیا اور انھیں چاہئے کہ فوراً ایک اور اعلان کریں کہ جنگ کے بعد دو یا تین برس کے اندر اندر ہندوستان کو مرتبۂ نوآبادی مل جائے گا۔ اب وہ ہندوؤں کی ہر پارٹی کی نظر میں اس وقت تک کے لئے قوم پرور ہیں جب تک کہ بحیثیت وزیر اعظم نہیں بلکہ بحیثیت سر سکندر حیات وہ مسلم لیگ کی کھلی ہوئی تائید اور حمایت کو ضروری نہ سمجھیں۔ ہر وزیر خواہ وہ چرچل ہو یا سکندر اس سے خوب واقف ہے کہ عوام کا حافظہ بہت کمزور ہے۔ اُن کے جذبات میں آسانی سے اشتعال پیدا کیا جا سکتا ہے اور اپنے اس علم سے پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ وزیر اعظم پنجاب نے مسٹر چرچل پر جس انداز سے نکتہ چینی کی ہے اس پر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ ٹھیک وہی ہے جو پرانی اماں کبھی کبھی بیگم کو ڈانٹنے کے لئے اختیار کرتی ہے۔ یعنی بچے کی حمایت کا بہانہ رکھکر۔ اہتمام وسعیِ جنگ کے مفاد کے بہانہ سے وائسرائے کو، حکومتِ ہند کو، حکومتِ برطانیہ کو، اس کے کسی وزیر کو جتنا جی چاہے ملامت کیجئے بہت پسندیدہ ہے۔ پھر ایسے موقع پر قوم پرستی کا بھی امتیاز کیوں نہ حاصل کر لیا جائے۔

اس بیان میں وزیر اعظم پنجاب نے بہت سی ایسی باتیں کہی ہیں جو مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے نہایت ہی درجہ قابلِ اعتراض ہیں۔ مگر وہ یقیناً انھوں نے مسلم لیگ کے ممبر کی حیثیت سے نہیں بلکہ وزیر اعظم پنجاب کی حیثیت سے کہی ہونگی۔ لہٰذا ان باتوں پر اگر کوئی سزاوارِ ملامت ہے تو وہ وزیر اعظم پنجاب یقیناً ہے۔ سر سکندر ہرگز نہیں۔ پھر یہ بھی سر سکندر ہی کے خیال کے مطابق۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ وزیر اعظم کی حیثیت سے ایک بات کر سکتے ہیں اور مسلم لیگ کے ممبر کی حیثیت سے دوسری بات۔ کچھ مضائقہ نہیں کہ دونوں باتیں اور دونوں عمل ایک دوسرے کی ضد ہوں۔

کون لیگی ہے جو یہ کہہ سکتا ہے کہ ہندو مسلم مسئلہ کا تصفیہ اور ہندوستان کے آئندہ دستور پر ان دونوں کے اتفاقِ رائے سے قبل تعیّن کر دیا جائے کہ ہندوستان کو درجۂ نوآبادیات فلاں وقت دے دیا جائے؛ اور اس پر کہ مسلم لیگ تو مرتبۂ نوآبادی کی قائل بھی نہیں۔ وہ مکمل آزادی چاہتی ہے۔ کون لیگی ہے جو اپنی طرف سے یہ خواہش کر سکتا ہے کہ اگر حکومتِ برطانیہ کی مقرر کی ہوئی ہندوستان کے مختلف مفادوں کی نمائندہ مجلس جس میں حکومتِ برطانیہ کے نمائندے بھی ہوں، ایک معیّنہ مدّت کے اندر کسی دستور پر متفق نہ ہو جائیں تو حکومتِ برطانیہ ان عناصر کے مشورے سے جو ہندوستان کے تحفظ میں شریک ہوں (اس کے باوجود کہ حکومت برطانیہ انھیں اعتماد کے ساتھ ذمّہ داری اور اختیار کے ساتھ شریک کرنے سے انکار کر دے) جو دستور مناسب سمجھے بنا دے! کون لیگی ہے جو اپنی پوری قوم اس کی نمائندہ انجمن مسلم لیگ اور اس کے لیڈر کو نظر انداز کر کے یہ کہیگا کہ ہندوستان کو آزادی تنہا ان لوگوں کی وجہ سے ملیگی جو مختلف محاذہائے جنگ میں (بلا اپنی قومی مرضی کے دخل کے) قربانیاں کر رہے ہیں اور شجاعتیں دکھا رہے ہیں! کون لیگی ہے جو یہ جانتے اور دیکھنے کے باوجود کہ مسلمانوں نے مسلم لیگ کی وساطت سے ہندوستان کے لئے ذمہ داری اور اختیار کی شرط کے ساتھ اپنی خدمات پیش کیں اور حکومتِ برطانیہ نے انھیں مسترد کر دیا یہ کہے کہ "برطانیۂ عظمیٰ اور ہندوستان کے ساتھ انصاف یہ ہے کہ یہ بات بلور کی طرح صاف کر دی جائے کہ اس جنگ میں جو ہمارے ساتھ نہیں ہے وہ ہمارا مخالف ہے"! ہمارے ساتھ سے مراد کون؟ سوائے حکومتِ برطانیہ کے اور صوبۂ پنجاب کے اس وزیر اعظم کے جو بلا کسی قومی پاسداری کے حکومتِ برطانیہ کا جزو ہونے پر نازاں ہے۔

یہی نہیں مسلم لیگ کے نو وارد۔ انگریزی ہفت وار اخبار "ڈان" (طلوعِ سحر)[۱] نے اپنی پہلی اشاعت میں لکھا ہے "سر سکندر حیات خاں صاحب عوام میں کچھ کہتے وقت اس بات کو قطعاً بھول جاتے ہیں کہ مسلم لیگ کی اطاعت شعاری بھی ان پر لازمی ہے۔ پنجاب کے وزیرِ اعظم کی یہ روش سب کے لئے پریشان کن بن جاتی ہے اور اس میں کوئی وقار نہیں ہوتا۔ انھوں نے گذشتہ اکتوبر کے

---

(۱) طلوعِ اسلام اس طلوعِ سحر کا دلی استقبال کرتا ہے اور اسے آفتاب نصف النہار بن جانے کی دعا دیتا ہے۔

اپنے بیان میں اس امر کا مطالبہ کیا ہے کہ حکومت اس بات کا فوری اعلان کر دے کہ جنگ کے بعد ایک مدتِ معینہ کے اندر ہندوستان کو درجۂ نوآبادیات دے دیا جائے گا۔ یہ بیان مسلم لیگ کی قرارداد لاہور اور مدراس کی روح کے منافی ہے۔ اور یہی قراردادیں دراصل مسلم لیگ کا نصب العین ہیں۔ درجۂ نوآبادیات یا کوئی اور درجہ۔ پاکستان کے بغیر ہندوستان میں ہندو راج کے مرادف ہے۔"

ہم اس باب میں پہلے دن سے کہتے چلے آئے ہیں کہ لیگ کی موجودہ روش خود لیگ کے مقاصد کیلئے بے حد نقصان دہ ثابت ہو رہی ہیں۔ ہمیں کسی کی ذلت سے کوئی تعرض نہیں۔ ہمارے نزدیک ہر وہ شخص جو ملتِ اسلامیہ کی حیاتِ اجتماعیہ کو تقویت پہنچانے کے لئے ایک قدم بھی آگے بڑھائے واجب الاحترام ہے خواہ اس کی دنیاوی حیثیت کچھ بھی نہ ہو اور اس کے برعکس تمام وہ لوگ جو مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کو کسی قسم کا نقصان پہنچائیں کسی رعایت کے مستحق نہیں ہیں۔ خواہ ثروت اور وجاہت کے موجودہ پیمانوں کی رو سے ان کی قدر و قیمت کتنی ہی کیوں نہ ہو ہم ایک مرتبہ پھر لیگ کے اربابِ بست و کشاد کے گوش گذار کرنا چاہتے ہیں کہ دو کشتیوں میں پاؤں رکھنے والے لوگوں کو مسامحت اور چشم پوشی سے ساتھ رکھے جانا مقاصدِ ملت کو بے حد نقصان پہنچا رہا ہے۔ غیروں کی مخالفت کے اثرات اس درجہ ضرر رساں اور دور رس نہیں جتنے اس قسم کے "اپنوں" کی بظاہر حمایت کے اثرات۔ اس سے قوم کی حالت مضحکہ خیز بن رہی ہے۔ جماعت میں ایسے عناصر کی موجودگی نہ صرف دوسروں کی نگاہوں میں ہی ذلت کا موجب ہوتی ہے بلکہ خود ان لوگوں کے دلوں میں جو خلوص و صدق دلی سے جماعت کے ساتھ ہوں ایسا اوقات تذبذب و تنزل کا باعث بن جاتی ہے۔ اور جب ایک مرتبہ یقین میں ارتیابی کیفیت پیدا ہو جائے تو پھر کسی مرحلہ میں بھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔

بڑے بھائی

یہ تو جناب سر سکندر حیات خاں صاحب کی اندوہناک روش کی حدیثِ الم تھی۔ ان کے بعد جناب فضل الحق صاحب کی یاد بھی کچھ کم جگر خراش نہیں۔ ان کے متعلق ہم نے اکتوبر کی اشاعت میں جو کچھ عرض کیا تھا اس پر ایک نگہِ بازگشت ڈال لیجئے۔ تاکہ حوادث و کوائف کی یاد

تازہ ہو جائے۔ ہم نے گذارش کیا تھا کہ اس قسم کے لوگوں کو۔ جو جوشِ غضب میں اپنا اعصابی توازن کھو بیٹھیں زیادہ غصہ نہیں دلانا چاہیے۔ انھیں جب نرمی سے سمجھایا جائے (یعنی ٹھنڈا پانی پلایا جائے) تو ان کا غصہ فرو ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی دونوں مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ کلکتہ سے شملہ کے سفر میں جناب فضل الحق صاحب کے خلاف مظاہرے ہوئے اور (بقول ان کے) انھوں نے شملہ میں چھپ چھپ کر دن کاٹے۔ نتیجہ یہ کہ انھوں نے کلکتہ پہنچکر فیصلہ کر لیا کہ ایک روزانہ اخبار نکالنا چاہیے جو ان کی حمایت میں پروپیگنڈہ کرے۔ چنانچہ اس اخبار کے دفتر کی رسمِ افتتاح پر انھوں نے اپنی تقریر میں صاف صاف کہدیا کہ پچھلے دنوں جو واقعات رونما ہوئے ہیں ان میں بنگال کے مسلم پریس نے خلافِ توقع ان کی مخالفت کی ہے اس لئے اس نئے اخبار کی ضرورت ہے۔

(ہندوستان ٹائمز ۱۵/۱۰/۴۱)

مسلمانوں میں تشتت و انتشار کے لئے یہی چیز کچھ کم نہ تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ اخبار کے ایڈیٹر قاضی نذرالاسلام تجویز کئے گئے ہیں۔ جو اپنے "برہمو سماجی اسلام" (یعنی انقلاب کی آڑ میں الحاد) کے لئے مشہور ہیں انھوں نے اپنی تقریر میں پہلے ہی کہدیا کہ اخبار "فرقہ وارانہ" مسلک سے مجتنب رہیگا (ایضاً) مولوی فضل الحق صاحب کا اخبار۔ اور مسلکِ اسلامیت (اسی کو قومیت پرستوں کی اصطلاح میں فرقہ پرستی کہا جاتا ہے) سے احتراز!

بک رہا ہوں جنوں میں۔ کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی (غالب)

یہ تو تھا شعلہ مزاجی کا مظاہرہ۔ اب زود پشیمانی ملاحظہ ہو۔ کابینۂ بنگال کے مسلمان وزراء نے (جن کے خلاف جناب فضل الحق صاحب کو شکایت تھی کہ انھوں نے ان کے خلاف سرزنش کی قرارداد میں حصہ لیا تھا) اپنی پوزیشن کو واضح کر کے جناب وزیرِ اعظم کو ٹھنڈا پانی پلا دیا۔ جس سے ان کا تمام غصہ فرو ہو گیا۔ اور انھوں نے تحریر فرمایا

"جہاں تک اس چٹھی کا تعلق ہے جو میں نے مسلم لیگ کے سکریٹری۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب کو لکھی تھی۔ میں مناسب اقدام کر رہا ہوں۔ جس سے میرے ان مسلمان بھائیوں کے

شکوک رفع ہو جائینگے جنھیں میرے مفہوم کے متعلق غلط فہمی پیدا ہوگئی۔ میں نہیں سمجھتا کہ میری طرف سے کسی خاص وضاحت کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ یہ چیز تو میرے حیطۂ خیال میں بھی نہیں آسکتی کہ میں مسلمانانِ بنگال اور مسلمانانِ ہند کے درمیان کسی قسم کا انتشار پیدا کروں اور اس کی وجہ بالکل بیّن ہے۔ یعنی مجھ سے زیادہ مسلمانان ہند میں اتحاد و یگانگت کا اور کون متمنی ہو سکتا ہے؟ میری تو انتہائی خواہش ہے کہ تمام مسلمان ایک ملّتِ واحد بن کر اپنی سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور معاشی ترقی کے لیے ایک مرکز کے ماتحت کام کریں۔ نہ ہی میں اس امر کی ضرورت سمجھتا ہوں کہ میں اس الزام کی بھی تردید کروں جو میرے خلاف عائد کیا جاتا ہے کہ میں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے کسی حکم سے سرتابی کی ہے۔ اس لئے کہ میں نے اپنی چٹھی میں کہیں یہ نہیں لکھا کہ مسلم لیگ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مسلمانانِ ہند (جن میں مسلمانانِ بنگال بھی شامل ہیں) کے اہم معاملات میں حکم بنے (یعنی اسی کا فیصلہ ان معاملات میں قولِ فیصل ہے)"۔

(ہندوستان ٹائمز [illegible])

دیکھ لیجئے ہم نے نہیں کہا تھا کہ

عادت بُری سہی یہ طبیعت بُری نہیں

دراصل (جیسا کہ پہلے بھی ہم لکھ چکے ہیں) یہ لوگ اعصابی مریض ہوتے ہیں۔ ان کی تلوّن مزاجی اور طفلانہ حرکات پر غم و غصہ کی بجائے ہمدردی کا اظہار ہونا چاہئے۔ جیسے مریضوں سے ہمدردی کا اظہار ہوتا ہے۔ افسوسناک بات صرف اس قدر ہے کہ قوم کی قحط الرجال کی مجبوری ہے کہ ایسے معذور لوگوں کے ہاتھ میں قوم کی باگ ڈور دینی پڑتی ہے۔ ان لوگوں کا صحیح مقام "سپاہی" کا مقام ہے۔ جہاں فیصلے کسی اور دماغ کے ہوں اور ان کا کام ان فیصلوں کو بروئے کار لانا ہو۔ لیکن مجبوری کا کیا علاج۔

دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

لیکن اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ یہ مجبوریاں اس وقت تک گوارہ کی جا سکتی ہیں جب تک یہ کسی اصول سے متعرض نہ ہوتی ہوں۔ اگر ان سے کسی اصول پر زد پڑتی ہے تو پھر ایسے "سہاگ سے رنڈاپا اچھا"

نعرۂ حق

نعرۂ حق سے جہاں میں انقلاب آنیکو ہے
دل کے ظلمت خانہ میں اِک آفتاب آنیکو ہے

پردۂ باطل کو اِلّا اللہ سی کردوں چاک چاک
اب جنونِ عشق پر گویا شباب آنیکو ہے

داستانِ بزمِ ہستی کسقدر بے کیف تھی
لیکن اب اس داستاں میں لکا باب آنیکو ہے

مضطرب میری جبیں تھی آستاں کے واسطے
آستاں سی اس تڑپ کا اب جواب آنیکو ہے

ہر رگِ گُل تھرتھراتی ہے وفورِ شوق سے
گلشنِ ہستی میں کوئی بے نقاب آنیکو ہے

تشنہ لب مشرق کے میخانوں میں تھی صدیوں سے ہم
اب شراب آنیکو ہے اور بے حساب آنیکو ہے

خونِ دہقاں سینچتا تھا خواجگی کا گلستاں
اب اسی کے خوں میں جوشِ التہاب آنیکو ہے

خون کے آنسو رُخِ مزدور پر بہتے رہے
اب انہیں اشکوں سی رُخ پر آب و تاب آنیکو ہے

کانپتا ہے آنے والے دَور سے سرمایہ دار
دستِ دہقاں میں مقدر کی کتاب آنیکو ہے

منتظر جس دَور کے صدیوں سی تھے اہلِ نظر
رحمتِ باری سے وہ دور اب شتاب آنیکو ہے

اِک قلندر کہہ رہا تھا مرقدِ اقبالؒ پر
تو نے دیکھا خواب، اب تعبیرِ خواب آنیکو ہے

(تاجؔ)

نسخہ اور اُس کا اِستعمال

حکیم صاحب کا کمرہ مریضوں سے بھرا رہتا تھا۔ حکیم صاحب باری باری ایک ایک مریض کی نبض دیکھتے، شاگرد کو نسخہ لکھوا دیتے۔ مریض آگے بڑھ جاتا اور شاگرد سے نسخہ بھی لے لیتا اور ترکیب استعمال بھی سمجھ لیتا۔ ایک مریض جب نسخہ لیکر جانے لگا تو حکیم صاحب نے خاص طور پر پوچھا کہ ترکیب استعمال سمجھ لی ہے۔ اس نے کہا "جی ہاں گرم پانی میں اچھی طرح جوش دیکر۔ چھان کر۔ سوتے وقت پی لینا ہے۔ ایک ہی مرتبہ" حکیم صاحب نے سر ہلایا اور کہا کہ ہاں! احتیاط سے پینا اور کل صبح آکر اطلاع دینا۔ مرض معمولی نہ سمجھنا۔ دوسری صبح مریض پھر آیا۔ حکیم صاحب نے نبض پر ہاتھ رکھا اور پوچھا کہ ہاں کہو کچھ فرق محسوس ہوا؟ مریض نے کہا کہ "نہیں حضور! کچھ فرق نہیں۔ بلکہ آج تو تکلیف اور بڑھ گئی ہے۔" حکیم صاحب گہری سوچ میں پڑ گئے۔ ماتھے پر ہاتھ رکھ لیا ایک گہری لمبی سانس لی اور کچھ اس آمیز لہجہ میں کہا "اچھا لاؤ نسخہ دکھاؤ"

"نسخہ!" مریض نے کہا "حضور نسخہ تو میں نے جوش دیکر پی لیا۔ نسخہ کہاں سے نکالوں؟" حکیم صاحب نے گھبرا کر آنکھیں اٹھائیں۔ "کیا کہا! نسخہ پی لیا۔" "جی حضور نسخہ جوش دیکر چھان کر پی لیا! چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چھلنی میں رہ گئے تھے۔ انہیں میں نے پھینک دیا تھا!" حکیم صاحب کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ جوش غضب میں بولے "ارے بدبخت۔ ایسا احمق! نسخہ کو جوش دیکر پی گیا؟" مریض حیران تھا کہ اس سے کیا خطا ہو گئی اس نے تو بالکل ایسا ہی کیا تھا جیسا اس سے کہا گیا تھا۔ حکیم صاحب نے پھر چلا کر کہا۔ "ارے بیوقوف! کبھی نسخہ کو بھی جوش دیکر پیا کرتے ہیں؟" مریض ابھی تک ششدر تھا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا معمہ ہے۔ حکیم صاحب نے اپنی ڈانٹ کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "پاگل! نسخہ میں جو دوائیاں لکھی تھی۔ انہیں دواخانہ سے لینا تھا اور وہ دوائیاں جوش دیکر پینی تھیں۔ نہ کہ اس کاغذ کے ٹکڑے کو جوش دینا تھا جس پر دوائیاں لکھی تھیں؟" مریض کو اب معلوم ہوا کہ اس کے مرض میں افاقہ کیوں نہیں ہوا۔

مریضوں کے ہجوم میں یہ خبر پھیل گئی۔ ہر شخص اس مریض کی حماقت پر ہنستا ہوا واپس لوٹا۔ شام تک شہر کے گلی محلے میں نسخہ کے اس انوکھے استعمال کا چرچا ہونے لگا۔ جو سنتا قہقہہ لگاتا۔ لیکن یہ نہ سمجھتا کہ یہ ہنسنا اس مریض پر نہیں۔ خود اپنے آپ پر ہنسنا ہے۔ اسے آج سے تیرہ سو برس پہلے ایک ایسے حکیم مطلق نے نسخہ دیا تھا جس کی حذاقت پر اس کا ایمان ہے۔ وہ نسخہ انسانیت کے تمام کہنہ اور پیچیدہ امراض کی مکمل تشخیص کے بعد مرتب ہوا تھا لیکن اس نے

اس نسخہ کے ساتھ بعینہٖ وہی کچھ کیا جو متذکرہ صدر مریض نے کیا تھا جس کی حماقت پر یہ یوں ہنستا ہے۔ اس نے اس نسخہ عظیمہ کو مقدس غلافوں میں لپیٹ کر رکھا۔ کبھی تعویذ بنا کر گلے میں لٹکایا کبھی زعفران اور مشک و عنبر سے لکھ کر دھو دھو کر پینا شروع کر دیا۔ کبھی دوائیوں کے نام کی گنتی شروع کر دی۔ نتیجہ یہ کہ مرض روز بروز بڑھتا گیا۔ اور مشکل اندر مشکل یہ کہ جب کبھی کسی نے سمجھانے کی کوشش کی کہ نسخہ کا استعمال صحیح نہیں ہو رہا۔ تو جھلا کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔ پھر طرہ یہ کہ نسخے کے اس انوکھے استعمال میں کچھ عوام ہی مبتلا نہیں ہیں بلکہ ایسی ایسی جلیل القدر ہستیاں بھی جنھیں خود طبیب ہونے کا دعوےٰ ہے۔ کہیئے! جس قوم کی حالت یہ ہو جائے اس کی شفایابی کی کیا امید ہو سکتی ہے!! افسوس کہ مسلمان نے یہ سمجھا ہی نہیں کہ وہ نسخہ کیمیا جو کائنات کے حکیم و خبیر نے عطا کیا تھا اس کی عظمت کیا ہے وہ عدیم المثال اور عظیم المرتبت نسخہ جس کے متعلق خود اس حکیم مطلق کا ارشاد ہے کہ

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ۵۶/۷۵-۸۰

میں (اے راہ گم کردہ انسانو) تمہیں اس لامحدود وسعتوں والے آسمان کے) ستاروں کے بلند مقامات کو گواہ ٹھہرا کر کہتا ہوں۔ اگر تمہیں علم ہوتا تو تم سمجھ لیتے کہ یہ شہادت کتنی عظیم الشان شہادت ہے۔ کہ یہ قرآن بڑی ہی قابل قدر و عزت کتاب ہے (جس کے حقائق فطرت کے) چھپے ہوئے صحیفہ میں (لپٹے پڑے ہیں جنھیں پاک اور (اہل) انسانوں کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا (اس لئے کہ) یہ اس خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب ہے جو تمام کائنات کا پرورش کرنے والا ہے۔

غور فرمایئے! رصدگاہ آسمانی کی بے پناہ بلندیوں کو گواہ ٹھہرا کر بتایا جاتا ہے کہ یہ قرآن کس قدر عظمت و توقیر عزت و تکریم والی کتاب ہے۔ یہ نسخہ عظیمہ کیسا نایاب اور بے مثال اور اپنے اثر اور نتیجہ کے لحاظ سے کیسا بلند اور یقینی ہے۔ لیکن اس کا اثر اور نتیجہ تو انھیں کے لئے ہوگا جو اسے صحیح طور پر استعمال کریں گے۔ جو اسے "جوش دے کر پی جائیں گے" انھیں فائدہ تو ایک طرف الٹا نقصان ہوگا۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ۝ ۱۷/۸۲

اور ہم نے جو کچھ قرآن میں سے نازل کیا ہے وہ ایمان والوں کے لئے (یکسر) شفا اور رحمت ہے،

لیکن جو اس کا صحیح استعمال نہیں کرتے ان کے لئے نقصان میں اضافہ کرنے کا موجب ہوتا ہے۔

قرآن کریم کا صحیح استعمال کیا ہے؟ اس کے لئے صرف اس قدر سمجھ لینا کافی ہے کہ یہ تمام نوع انسانی کے لئے ضابطۂ زندگی ہے۔ اس ضابطہ کو پڑھا اس لئے جاتا ہے کہ سمجھ میں آجائے اور سمجھا اس لئے جاتا ہے کہ زندگی اس کے مطابق بسر کیجائے۔ لیکن اگر نسخہ کے انوکھے استعمال کی طرح اس ضابطۂ زندگی کو بازوؤں سے باندھ لیا جائے۔ گلے میں لٹکا لیا جائے۔ گھول گھول کر پینا شروع کر دیا جائے اس کے الفاظ و حروف کی گنتی شروع کر دی جائے اور توقع یہ کیجائے کہ جو فوز و فلاح اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی نتیجہ ہے وہ ہمیں اس انوکھے مگر سہل طریقہ سے ہی مل جائے تو نتیجہ سوائے خسران کے اور کیا ہوگا!

اس بے محل استعمال کو دور حاضرہ کے ایک بہت بڑے عملی مفکر نے ایک اور مثال سے واضح کیا ہے۔ آجکل تو خیر پھر چرخہ کی گونج کچھ مدھم پڑ گئی ہے۔ لیکن جس زمانے میں تحریک سودیشی زوروں پر تھی۔ ہر شخص کی زبان پر چرخہ ہی چرخہ تھا۔ چرخہ کے فلسفہ پر مضامین لکھے جاتے چرخہ کی اہمیت پر خطبات دئے جاتے چرخہ کی نمائش ہوتی مقابلے ہوتے۔ چرخہ کو ہندوستان کی تمام مصائب و مشکلات کا حل بتایا جاتا۔ یہاں کی غربت و افلاس بیکاری و ناداری۔ ذلت و محکومی کا علاج چرخہ تجویز کیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ لفظ تو صرف چرخہ تھا لیکن اس سے مقصود وہ عظیم الشان[1] تحریک تھی جس سے غیر ممالک کی مصنوعات (بالخصوص کپڑے) کی جگہ ہندوستان کی مصنوعات کو رواج دینا منتہائے نظر تھا اور یہ تحریک تھی وہ اصل جس سے ہندوستان کے افلاس و ناداری غرضیکہ ہر بیماری کا علاج سوچا گیا تھا۔ اس مفکر نے اس زمانے میں لکھا تھا آج سے سو دو سو برس بعد جب چرخہ اور اس کی داستانیں تو موجود ہوں گی مگر یہ تحریک قصۂ ماضی بن چکی ہوگی۔ اس وقت کو ذرا تصور میں لائیے اور سوچئے کہ ایک ضعیف بڑھیا نے اپنی کوٹھری کے ایک ممتاز حصہ میں چرخہ رکھا ہے۔ اس پر اپنی عقیدت کے خوشنما غلاف چڑھائے ہوئے ہیں سامنے اپنی شردھا کے پھول بھی ڈال رکھے ہیں۔ گھر میں مفلسی ہے۔ جوان بیٹا بستر مرگ پر پڑا ہے وہ علی الصبح اٹھتی ہے۔ ٹھنڈے پانی سے اشنان کرتی ہے۔ گنگا جل لاکر چرخہ کی مورتی پر چھڑکتی ہے۔ پھر لوبان کی دھونی دیتی ہے۔ اور اس کے سامنے ہاتھ پھیلا کر گڑگڑاتی ہے کہ ہے بھگوان! تو نے جس طرح گاندھی مہاراج کے زمانہ میں بھارت ورش کی بپتاؤں کو دور کیا تھا جس طرح

---

[1] ظلم کے معنی ہیں وضع الشیء فی غیر موضعہ المختص بہ (المفردات)
کسی شے کا غیر محل استعمال ۱۲

تو نے اس وقت ان کی مفلسی اور غریبی کو امیری سے بدل دیا تھا جس طرح تو نے ان کے روگ اور دکھ دور کر دئے تھے۔ آج اس غریب۔ بتیا کی ماری دکھیا پر بھی دیا (رحم) کیجیو۔ گھر میں پیسہ نہیں۔ بیٹا بیمار ہے۔ ہے بھگوان میرے بیٹے کو اچھا کر دے۔ میری غریبی کی بتیا کو کاٹ دے۔ وہ ہاتھ باندھے دعائیں کرتی ہے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی جاری ہے اور اس کے بعد نہایت اطمینان سے اٹھ بیٹھتی ہے اور آس لگائے رہتی ہے کہ اب سب دکھ دور ہو جائیں گے۔ بتیا کٹ جائے گی۔ بیٹا اچھا ہو جائے گا۔ لیکن نہ دکھ دور ہوتے ہیں نہ بتیا کٹتی ہے۔ نہ بیٹا اچھا ہوتا ہے۔ یہ کیوں! اس لئے کہ اس نے چرخہ کا مفہوم نہیں سمجھا۔ چرخہ ایک عملی تحریک کا نشان (Symbol) تھا اور اس عملی تحریک کے نتائج تھے جو دکھ اور درد کو دور کرتے تھے۔ چرخہ کی پوجا پاٹ سے کچھ نہیں ہو سکتا۔

قرآن ایک عملی تحریک کا بے مثال ضابطہ ہے۔ اور اس کے زندہ و پائندہ۔ درخشندہ و تابندہ نتائج اسی وقت مرتب ہو سکتے ہیں جب اس کی حامل قوم کا عمل اس کے متعین کردہ نظام کے مطابق ہو۔ نہ یہ کہ اس کے حروف و الفاظ کو گھول گھول کر پیا جائے۔ قرآن کا یہی وہ بے محل استعمال (ظلم) ہے جس کا نتیجہ خسران و نقصان کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ کہ یہ خود قرآن ہی کا فیصلہ ہے۔

سال گذشتہ طلوع اسلام کے صفحات پر قرآن کریم کے اسی بے محل استعمال کے چند نمونے پیش کئے گئے تھے۔ جو ہمارے علوم دینیہ کے مرکز دیوبند شریف سے شائع ہونے والے رسالہ خالد سے نقل کئے گئے تھے۔ آج اسی قبیل سے کچھ اور پیش کیا جاتا ہے۔ ان کی اہمیت اس لئے ہے کہ یہ ایک ایسی بزرگ ہستی کے تجویز فرمودہ ہیں جو آج ہندوستان کے ارباب شریعت و طریقت میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ علوم شریعت میں بھی مرجع انام ہے اور رموز طریقت میں بھی بے شمار انسانوں کے نزدیک منبع فیوض قرآن کریم کے مفسر و مترجم۔ بے شمار کتب دینیہ کے مصنف اور ایک بہت بڑے آستانہ کے مسند نشین۔ اس دور میں اس سے بڑھ کر بلندی مقام اور کیا ہو سکتی ہے۔ غور فرمائیے کہ جب خود ایک حکیم الامّت نسخہ کو جوش دیکر پینا شروع کر دے اور اسی کی تلقین کرے تو مریضوں کا خدا حافظ!

لیجئے اب لطائف ملاحظہ فرمائیے۔ قارئین کی سہولت کے لئے ہر ایک لطیفہ کے بعد ہم نے آیت متعلقہ کا ترجمہ (جس سے مفہوم سمجھ میں آجائے) قوسین میں لکھ دیا ہے۔

(۱) فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ط

خاصیت: یہ آیت پڑھ کر خربوزہ یا کوئی چیز تراشے تو انشاء اللہ تعالیٰ شیریں و لذیذ ہوگی۔

(آیت کا مطلب: سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل کا ایک واقعہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں

حکم دیا کہ ایک گائے (یا بیل) ذبح کریں۔ انھوں نے اس سیدھے سادے حکم کی تعمیل میں بیسیوں حجتیں کیں اور بصد مشکل اس پر آمادہ ہو گئے۔ فَذَبَحُوهَا ۔ پس انھوں نے ذبح کیا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ط اور ان کا جی نہیں چاہتا تھا کہ ایسا کریں۔ غالباً لفظ ذبح کی رعایت سے خربوزہ تراشنا لکھا گیا ہے۔)

(۲) أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ط

خاصیت:۔ اگر سواری کا کوئی جانور گھوڑا اونٹ سواری کے وقت شوخی و شرارت کرے اور چڑھنے نہ دے تو اس آیت کو تین مرتبہ پڑھ کر اس کے کان میں پھونک دے۔ انشاء اللہ تعالےٰ سیدھا ہو جائے گا۔

(آیت کا مطلب:۔ کیا یہ لوگ اللہ کے قانون کی اطاعت کے علاوہ کوئی اور ضابطہ حیات اپنے لئے اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ (انھیں دیکھنا چاہیئے کہ) آسمانوں میں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے طوعاً وکرہاً اسی کے (قانون کے) آگے جھکا ہوا ہے۔ اور سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ یعنی جب کائنات کی ہر شے اللہ کے قانون مشیت کے ماتحت زندگی بسر کر رہی ہے تو کیا انسان جو خود کائنات ہی کا ایک جزو ہے۔ اپنے لئے قرآن کے علاوہ کوئی اور ضابطہ زندگی اختیار کرنا چاہتا ہے؟)

(۳) إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ رَبِّي وَرَبِّكُمْ مَا مِنْ دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ط

خاصیت:۔ اگر کوئی لونڈی یا غلام سرکش ہو تو بال پیشانی کے پکڑ کر تین مرتبہ اس کو پڑھے اور اس پر دم کرے انشاء اللہ تعالےٰ تابعدار اور مسخر ہو جائے گا۔

(آیت کا مطلب:۔ میں اس اللہ پر بھروسہ کرتا ہوں جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے (اور جس کا قانونِ مکافاتِ عمل ایسا محکم گیر ہے کہ) کوئی جاندار ایسا نہیں جسے وہ پیشانی سے پکڑ کر اس سے مواخذہ نہ کرے۔ یقیناً میرا رب ایک سیدھے راستہ پر ہے۔ یعنی اللہ کے قانون مکافاتِ عمل کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ لفظ ناصیہ پیشانی سے غالباً اس طرف خیال گیا ہے)

(۴) كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ

خاصیت:۔ اگر راستہ میں کوئی شیر یا کتا حملہ کرے اور شور مچا دے تو فوراً اس آیت کریمہ کو پڑھ لے چپ ہو جائے گا۔

(آیت کا مطلب :۔ سورۂ کہف میں ہے کہ اصحاب کہف کا کتا اپنے بازو پھیلائے غار کے منہ پر بیٹھا ہے۔
آیت اور خاصیت کا باہمی ربط ظاہر ہے۔)

(۵) اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۙ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۙ وَ اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۙ
وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ۙ

خاصیت :۔ ان آیتوں کو لکھ کر ولادت کی آسانی کے لئے بائیں ران میں باندھ دے انشاء اللہ تعالےٰ بہت آسانی سے ولادت ہوگی۔ مگر بعد ولادت تعویز کو فوراً کھول دینا چاہیئے اور اسی عورت کے سر کے بال کی دھونی مقام خاص پر دینا مفید ولادت ہے۔

(آیات کا مطلب :۔ یہ سورۂ انشقاق کی آیات ہیں جن میں قیامت کی نشانیوں کا ذکر ہے۔ ترجمہ یہ ہے "جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کا حکم سن لے گا اور وہ اس لائق ہے۔ اور جب زمین کھینچ کر بڑھا دی جائے گی اور زمین اپنے اندر کی چیزوں کو اگل کر خالی ہو جائے گی"۔ ربط ظاہر ہے)

(۶) اگر دردِ زہ سے تکلیف ہو تو عورت موطا امام مالک (مجموعہ احادیث) پر ہاتھ رکھے فوراً ولادت ہو جائیگی۔

(۷) فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

خاصیت :۔ جس سے حاکم ناراض و خفا ہو۔ وہ اس آیت کو پڑھا کرے یا لکھ کر بازو پر باندھ لیوے انشاء اللہ تعالےٰ حاکم مہربان ہو جائے گا۔

(مطلب :۔ اللہ تعالےٰ نے حضور کو تسلی دی ہے کہ ان سرکش مخالفین کی فتنہ انگیزیوں سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اللہ ان سب کے خلاف تیرے لئے کفایت کرے گا وہ سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے)

(۸) جو شخص ساتوں حٰمٓ کو پڑھا کرے اس پر دوزخ کے ساتوں دروازے بند ہو جائیں گے۔

(۹) هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ
الرَّحِيْمُ ۝

خاصیت :۔ اسم اعظم اس میں مخفی ہے۔ جو کوئی صبح کے وقت سات مرتبہ پڑھے تو شام تک اس کے واسطے فرشتے دعائے مغفرت کریں اور اگر اس دن میں مرے تو شہید کا درجہ پائے گا اور اگر شام کو پڑھے تو صبح تک اس کے واسطے فرشتے دعائے مغفرت کریں اور جو اس شب میں مرے تو درجہ شہادت کا پاوے۔

(ترجمہ: "اللہ کی ذات وہ ہے کہ جس کے سوائے کوئی اور اللہ نہیں۔ وہ غیب و شہادت کا جاننے والا اور رحمٰن و رحیم ہے۔ غالباً لفظ شہادت (یعنی حاضر و غیب کا جاننے والا) کی نسبت سے درجہ شہادت کہا گیا ہے)

(۱۰) اَلْقَیُّوْمُ

خاصیت:۔ اس کی کثرت سے نیند آتی ہے۔

(القیوم یعنی۔ ایسا قائم کہ جسے اپنے قیام و بقا کے لئے کسی آسرے کی ضرورت نہ ہو۔ غالباً "نیند" کی طرف خیال اس لئے گیا کہ القیوم کے بعد ہے کہ نہ اسے نیند چھو سکتی ہے نہ غنودگی۔ حالانکہ القیوم کی تاثیر سے تو سونے والوں کو بھی بیدار ہو جانا چاہیئے)

(۱۱) اَلْمُغْنِیُ

خاصیت:۔ اگر مشغولی جماع کے وقت خیال سے پڑھے تو بیوی اس سے محبت کرنے لگے (المغنی سب سے بے نیاز اور سب کا حاجت روا)

(۱۲) اَلرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ط

خاصیت:۔ اگر طالب مطلوب کا نام مع نام والدہ کے لکھے۔ اس کی محبت میں سرگرداں ہو بشرطیکہ جائز محبت ہو۔

(۱۳) اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

خاصیت:۔ اگر یہ آیت پڑھ کر گم ہوئی چیز کی تلاش کی جائے تو انشاء اللہ تعالےٰ ضرور مل جائے ورنہ غیب سے اسے کوئی چیز اس سے عمدہ ملے گی۔

(مطلب آیت:۔ قرآن کریم میں مصائب و مشکلات میں استقامت کی تلقین کے بعد فرمایا کہ ایسے لوگوں کا مطمح نگاہ یہ ہونا چاہیئے کہ ہم سب اللہ ہی کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

(۱۴) یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ اِنَّ زَلْزَلَۃَ السَّاعَۃِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ط

خاصیت:۔ حفظ حمل کے لئے مفید ہے۔

(مطلب:۔ اے لوگو اپنے رب سے ڈرتے رہو۔ یقیناً قیامت کا زلزلہ ایک عظیم شے ہے)

(۱۵) اگر پوری سورۂ نوح سوتے وقت پڑھ لی جائے تو احتلام سے محفوظ رہے گا۔

اتنے ہی کافی ہیں زیادہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ورنہ کتابوں میں تو بڑے بڑے دلچسپ خواص لکھے ہیں ان وظائف وغیرہ کا نام رکھا جاتا ہے قرآن کے اعمال۔ حالانکہ قرآن کا عمل تو صرف وہی عمل کہلا سکتا تھا جو قرآن کے احکام کی اتباع میں سرزد ہو۔ پھر یہ خاصیتیں کہاں تک قابل اعتبار ہو سکتی ہیں یہ قرآنی آیات کے اس انوکھے استعمال کے دریافت کرنے کے طریقے تو ظاہر ہے جو مؤلف نے خود بتا دیا ہے کہ

"احقر کو حضرت مرشدی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اگر کوئی حاجتمند تعویذ وغیرہ لینے آوے تو انکار مت کیا کرو۔ چنانچہ احقر کا معمول ہے کہ اس حاجت کے مناسب کوئی آیتہ قرآنی یا کوئی اسم الٰہی سوچ کر لکھ دیتا ہے اور بفضلہ تعالٰی اس میں برکت ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک بی بی کی مانگ با وجود کوشش بار بار کے سیدھی نہ نکلتی تھی احقر نے کہا اِھدِنَا الصِّرَاطَ المُستَقِیمَ پڑھ کر مانگ نکالو۔ چنانچہ اس کا پڑھنا تھا اور مانگ بے تکلف سیدھی نکل آئی احقر نے یہ حکایت اس لئے عرض کی ہے کہ اور کوئی طالب بھی اس معمول کو اختیار کرے تو امید نفع اور برکت ہے۔"

غور فرمائیے ان "اعمال قرآنی" نے خود قرآن کریم اور اس پر ایمان رکھنے والوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے اس زندگی میں فراخیٔ رزق۔ نیک اولاد۔ دشمن پر غلبہ۔ عزت کی زندگی۔ شیطان سے دوری۔ علمی خزانوں کا علم۔ چوری سے حفاظت۔ ادائیگی قرض۔ جملہ جسمانی امراض سے شفاء۔ اور آخرت میں جنت۔ شہادت کا مرتبہ۔ رسول اللہ کی شفاعت دوزخ سے نجات۔ غرضیکہ اس زندگی اور آئندہ زندگی میں جس چیز کی بھی تمنا کی جا سکتی ہے وہ چند اوراد اور وظائف کے پڑھنے سے یا اگر پڑھ نہ سکتا ہو تو لکھ کر چاٹ لینے سے یا بازو پر باندھ لینے سے غیر مشروط طور پر گرانٹی کر دی گئی ہے اور کوئی ایسی ضرورت باقی نہیں رکھی گئی جس کے لئے قرآن کریم کو ضابطہ حیات بنایا جائے۔ خدا کی راہ میں مشکلات و خطرات کا مقابلہ کرنا۔ خطرات میں استقلال و استقامت سے جمے رہنا۔ میدان جہاد میں سر بکف آجانا۔ یہاں کی موت میں حیات ابدی کا راز مضمر دیکھنا۔ یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان لوگوں کے نزدیک اس قسم کے اعمال قرآنی جو محمد رسول اللہ والذین معہ کا ضابطہ زندگی بنے تھے۔ کچھ پیچیدہ اور لمبے راستے ہیں۔ اس لئے ان کی جگہ اس زندگی میں کامیابی اور آخرت میں سرفرازی کے لئے نزدیک صراط مستقیم یا (Short Cut) قرآن کی آیات کے ان "باطنی معانی" میں مضمر ہے جن عمل پیرا ہونے کے لئے کسی صبر آزما مرحلہ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اور یوں مفت میں بیٹھے بٹھائے جنت مل جاتی ہے۔

بیٹھے بیٹھے ہر ادا باب ہمہ است
بیٹھے پھر یا کہ این حرم است
جگہ بندی و بت خانہ را کہ تو خاک باش
بیٹھے بیٹھے کی اللہ ہم است

(اقبال)

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب! ان اوراد و وظائف کو خود کر کے دیکھ لیجئے ان میں واقعی اثر ہوتا ہے ہمیں بھی معلوم ہے کہ ایک حد تک اثر ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ہو گا تو اس لئے نہیں کہ ورد قرآن کی آیت کا کیا گیا ہے۔ جو لوگ قرآن کریم سے واقف بھی نہیں ہوتے کھلا ہوا شرک کرتے ہیں۔ وہ بھی ایسے ایسے اعمال کرتے اور بتاتے ہیں جو ممکن ہے کہ تاثیر کے اعتبار سے ان اوراد و وظائف قرآنی سے بھی بڑھ جائیں کیونکہ تاثیر زیادہ تر عمل کرنے والے کی ذہنی قابلیت پر منحصر ہوتی ہے۔ اس (Phenomenon) کا تعلق علم النفس (Psychology) سے ہے۔ ایک خاص طریقہ سے جن الفاظ کو بھی بطور وظیفہ کے پڑھیئے یا لکھئے اس قسم کے اثرات پیدا کر سکتے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی طویل ہے۔ جسے ہم انشاء اللہ کسی دوسرے موقع پر پیش کریں گے اس وقت تو صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ کس طرح یہ نسخہ کا انوکھا استعمال طبیب مطلق کے بتائے ہوئے علاج سے باز رکھتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وارثین کتاب کی وہ جماعت جسے دنیا کی امامت کے لئے پیدا کیا گیا تھا آج دنیا میں سب سے پیچھے ہے ان کی وہ علمی قوتیں جو انھیں دنیا کے سخت سے سخت مقابلہ میں سینہ سپر کر دیا کرتی تھیں مفقود ہو چکی ہیں قرآن کریم کی برکت سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن اس کی برکت اس پر عمل پیرا ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ جھاڑ پھونک اور گنڈہ تعویز سے برکت حاصل کرنے کا ذکر قرآن میں تو کہیں ہے نہیں۔

رجسٹرڈ ایل نمبر 4240

معاملہ کی ضروری باتیں

(۱) **طلوع اسلام** ہر انگریزی مہینے کی یکم و التزاماً شائع ہو جاتا ہے اور نہایت احتیاط سے حوالہ ڈاک کیا جاتا ہے

(۲) رسالہ موصول نہ ہونے کی اطلاع زیادہ سے زیادہ دس تاریخ تک دیجئے ورنہ بعد میں شاید پرچہ موجود نہ ہو اور اگر موجود بھی ہوگا تو بلا قیمت نہ مل سکے گا۔

(۳) تبدیلی پتہ کی اطلاع ۲۵ تاریخ سے پہلے پہلے آنی چاہیئے۔

(۴) جس ماہ کی خریداری کا چندہ ختم ہو جاتا ہے اس مہینہ کے پرچے کے اندر ایک اطلاعی جوابی کارڈ رکھ دیا جاتا ہے جواب ایک ہفتہ کے اندر اندر آجانا چاہیئے

(۵) چندہ سالانہ پانچ روپیہ مع محصول ڈاک ہے قیمت فی پرچہ ۸/ چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجنے میں خریدار کو کفایت اور منتظمین کو سہولت رہتی ہے۔

(۶) ہر رقم موصولہ (خواہ کسی ذریعہ سے موصول ہو) کی ایک رسید بھیجی جاتی ہے۔

(۷) وی۔ پی طلب کرنے کے بعد اسے موصول نہ کرنا ادارہ کو بلا جرم سزا دینے کے مرادف ہے۔

(۸) منی آرڈر کرتے وقت اپنا پورا پتہ اور صاف لکھئے نیز رقم کی تفصیل بھی درج فرمائیے۔

(۹) آپ اپنا تعارف **نمبر خریداری** کے ذریعہ ہی کرا سکتے ہیں اس لئے اس نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولئے ورنہ ہمیں بیحد دقت اور آپ کو ناواجب شکایت ہوگی۔

(۱۰) نمبر خریداری یاد نہیں رہا کرتا کہیں نوٹ کر چھوڑیئے۔

(۱۱) "**طلوع اسلام**" کوئی تجارتی ادارہ نہیں۔ بلکہ ملت اسلامیہ کے اجتماعی مقاصد کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے اس لئے اس کیساتھ اشتراک عمل اور معاونت ایک ملی خدمت ہے۔

(۱۲) خوش معاملگی کی استواری کی بنا یہ ہے کہ فریقین ہر وقت خدا کو اپنے درمیان رکھیں۔ واللّٰہ المستعان

(۱۳) نمونے کے پرچے کے لئے [illegible] ٹکٹ آنے ضروری ہیں۔

ناظم

ادارہ طلوع اسلام دہلی